ISSN : 2582-1229 بین الاقوامی پیر ریویو، ریفریڈ جرنل

(سہ ماہی)

تاریخِ ادبِ اردو

جلد۔۳ شمارہ۔۱

سرپرستِ اعلیٰ: ارتضیٰ کریم

مدیر: ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا

سہ ماہی دھلی

تاریخِ ادبِ اردو

جلد:۳ (اردو ادب کا نقیب اور ترجمان) **شمارہ**:۱

جنوری تا مارچ ۲۰۲۱

سرپرست اعلیٰ:
ارتضیٰ کریم

مدیر: ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر محمد بہلول

سرپرست: ڈاکٹر راکیش کمار پانڈے، پروفیسر رئیس انور رحمٰن، پروفیسر کوثر مظہری، پروفیسر محمد رضی الرحمٰن، ڈاکٹر پرمود کمار بھارتی۔

مجلس مشاورت:

بیرون ملک: پروفیسر یوسف خشک (پاکستان)، پروفیسر ضیا حسن (پاکستان)، پروفیسر حلیل طوقار (ترکی)، ڈاکٹر محمد سلمان بھٹی (پاکستان)، پروفیسر احمد القاضی (مصر)، ڈاکٹر سمیرا بشیر (پاکستان)، پروفیسر ثمینہ گُل (پاکستان)، پروفیسر اسومان اوذکین (ترکی)، پروفیسر دُرمُش بُلگر (ترکی)، فرزانہ اعظم لطفی (ایران)، ڈاکٹر علی بیات (ایران)، ڈاکٹر محمد کیومُرسی (ایران)، ڈاکٹر ذکائی کارداس (ترکی)

اندرون ملک: پروفیسر خالد اشرف، ڈاکٹر محمد محسن، ڈاکٹر نوشاد مومن، ڈاکٹر دانش الہ آبادی، پروفیسر آلِ ظفر، ڈاکٹر مجیب احمد خان، ڈاکٹر مشتاق عالم قادری، ڈاکٹر محمد داؤد محسن، رضوان ندوی، ہاجرہ نور احمد زریاب، ڈاکٹر مِتھن کمار، ڈاکٹر رحمٰن اختر، ڈاکٹر بلرام شکلا، ڈاکٹر شاہد رزمی۔

معاون: ڈاکٹر شبیر عالم

قانونی مشیر: ایڈوکیٹ انل کمار سنگھ، ایڈوکیٹ سیما سنگھ

ازتعاون

فی شمارہ	اس شمارے کی قیمت	سالانہ	خصوصی
50	200	10000	5000

رابطہ سہ ماہی ''تاریخِ ادب اردو''

2496, 2nd Floor, Punjabi Basti, Subzi Mandi, Ghanta Ghar, Delhi-07
E-mail: taudelhi@yahoo.com
E-mail: urisath@gmail.com
E-mail: editortau@gmail.com
E-mail: urdueditorial@gmail.com
A/c Name : PEACE INDIA FOUNDATION
A/c No : 51521131001918
IFSC : PUNB0515210
Mobile No. : +91-9968244001

مالک، طابع وناشر ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا نے جے کے آفسیٹ پرنٹنگ پریس، سے چھپوا کر دفتر ''تاریخ ادب اردو'' ۲۴۹۶، دوسری منزل، پنجابی بستی، سبزی منڈی، گھنٹہ گھر، دہلی۔۱۱۰۰۰۷ سے شائع کیا۔

''تاریخِ ادب اردو'' کی مشمولات سے مدیر/وابستگان کا متفق ہونا لازمی نہیں۔ ''تاریخِ ادب اردو'' سے متعلق کسی بھی تنازعہ کا حقِ سماعت صرف دہلی کی عدالت میں ہوگا۔

مشمولات

اداریہ

مضامین:

1۔فرحتِ روح کا شاعر: اصغرگونڈوی	ڈاکٹرمحمدیحیٰ صبا	8
2۔جہانِ نو کی تسخیر کا نسخۂ کیمیا	ڈاکٹرمحمدنظام الدین	16
3۔کوروناوائرس: ایک مضراورمہلک وبا	ڈاکٹرشیریں فاطمہ	24
4۔پس نوآبادیاتی تنقیداورفرانززفینن	محمدامان اللہ خان	46
5۔رفیعی اجمیری: ایک جواں مرگ۔۔۔	چھوٹولال	80
6۔مختارٹانکی: بحیثیت طنزومزاح نگار	سلطانہ فاطمہ انصاری	88
7۔ڈاکٹرترنم ریاض: شخصیت اورشاعری	رائلہ فاطمہ انصاری	96
8۔تہذیبی واخلاقی اقدارکابحران اوراردوناول	ڈاکٹرواثق الخیر	105

اداریہ

عالمگیر وبا کووڈ۔19 نے جہاں دنیا بھر کی معیشت، معمولاتِ زندگی متاثر کیے، وہیں تعلیم کا پہیہ بھی گھومتے گھومتے اچانک رُک گیا۔ آج سے قریباً ایک سال پہلے جب چین میں کورونا وائرس کی تشخیص ہوئی، تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک نادیدہ وائرس پوری دنیا میں اس قدر تباہی مچادے گا کہ آن کی آن میں سارا کاروبارِ حیات ہی مفلوج ہو کے رہ جائے گا۔ ویسے تو پورا سال ہی تعلیمی اعتبار سے انتہائی اہمیت کا حامل ہوتا ہے، لیکن جنوری سے موسمِ گرما کی تعطیلات تک کا عرصہ تمام ہی اداروں میں اہم سمجھا جاتا ہے کہ اسی دوران اسکولز، کالجز اور یونورسٹیز میں نئے تعلیمی سال کا آغاز ہوتا ہے۔

نویں، دسویں، گیارہویں اور بارہویں جماعتوں کے بچّے امتحانات کی تیاریوں میں مشغول ہوتے ہیں، ان کے پریلیمنری امتحانات کا سلسلہ، کوچنگ سینٹرز میں ایکسٹرا کلاسز، نصاب جلد از جلد مکمل کروانے اور امتحانات کی تیاری کروانے کا عمل زور و شور سے جاری ہوتا ہے، تو دوسری جانب جنوری سے جامعات کی کلاسز بھی شروع ہوجاتی ہیں۔

سو، اس تناظر میں دیکھا جائے تو سال کے ابتدائی چھے ماہ تعلیمی حوالے سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ مگر فروری 2020ء کے بعد سے جہاں ہندوستان میں کورونا وائرس کے باعث تمام شعبہ ہائے زندگی متاثر ہوئے، وہیں شعبۂ تعلیم بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ ویسے تو مُلکِ عزیز میں یہ شعبہ پہلے ہی خاصی عدم توجّہی کا شکار ہے، لیکن کورونا نے تو رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔

اس دوران پوری دنیا کی طرح ہندوستانیوں نے بھی آئسولیشن، لاک ڈاؤن، قرنطینہ (Quarantine)، سوشل ڈسٹینسنگ'' جیسی اصطلاحات سیکھیں تو آن لائن کلاس کی اصطلاح بھی زبانِ زدِ عام ہوگئی۔ واضح رہے کہ آخر الذکر وہ اصطلاح ہے، جس نے طلبہ کو سُست، کاہل بنانے کے ساتھ تعلیم سے مزید دُور کردیا ہے۔

خیر، اللہ، اللہ کر کے اکتوبر نومبر 2020 سے احتیاطی تدابیر کے ساتھ تعلیمی ادارے کھول دیئے گئے۔طویل تعطیلات کے بعد آہستہ آہستہ طلبہ روٹین پر آنا شروع ہو گئے تھے۔اسکولز میں امتحانات کا شیڈول جاری ہو چکا تھا، کلاس ٹیسٹس ہو رہے تھے کہ حکومت نے کورونا وائرس کی وبا کی دوسری لہر کے پیشِ نظر ایک بار پھر ملک بھر کے تعلیمی ادارے بند کرنے کا اعلان کر دیا۔کورونا وائرس کی شدید لہر کے نتیجے میں جب حکومت کی جانب سے پہلی مرتبہ تعلیمی سلسلہ منقطع کرنے اور آن لائن کلاسز شروع کرنے کا نوٹی فکیشن جاری کیا گیا، تو اسکولز سے لے کر ہائر ایجوکیشن تک تمام ہی اداروں نے وَرچوئل اور آن لائن کلاسز کا آغاز کیا۔تاہم، آن لائن کلاسز کے اطلاق میں صرف پرائیویٹ تعلیمی ادارے ہی کچھ حد تک کامیاب رہے، جب کہ سرکاری تعلیمی ادارے، بالخصوص اسکولز اور کالجز وسیع وعریض عمارتوں اور وافر بجٹ رکھنے کے باوجود آن لائن تدریس فراہم کرنے میں بری طرح ناکام نظر آئے کہ اوّل تو اساتذہ ہی جدید ٹیکنالوجی سے نابلد ہیں، پھر دُور دراز علاقوں میں کمپیوٹرز، لیپ ٹاپس، اسمارٹ فونز اور انٹرنیٹ کی عدم دست یابی، انٹرنیٹ کے کمزور سگنلز اور طلبہ کے لیے آن لائن سسٹم سے آگہی نہ ہونا چند ایسے بنیادی مسائل ہیں، جن سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ معاشی طور پر بدحال خاندانوں کے لیے اپنے بچوں کو یہ سہولتیں دینا ناممکن ہی ہے۔ ویسے بھی سوچنے کی بات ہے کہ ایسے خاندان جو تیز ترین انٹرنیٹ، کمپیوٹر یا لیپ ٹاپ افورڈ کر سکتے ہیں، وہ اپنے بچوں کو سرکاری اسکولز میں تعلیم کیوں دلوائیں گے، وہ بھلا اپنے بچوں کا مستقبل ایسے اداروں کے رحم وکرم پر کیوں چھوڑیں گے...؟؟

پسماندہ اور دور دراز علاقوں میں تو انٹرنیٹ کی سروس میسّر ہی نہیں اور ہر اسمارٹ فون میں بھی 4جی کی سہولت موجود نہیں ہوتی، تو ایسے میں آن لائن کلاسز پس ماندہ علاقوں کے طلبہ کے لیے تو کسی طور سود مند ثابت نہیں ہوسکتیں۔پھر آن لائن کلاسز کے حوالے سے ایک مشکل یہ بھی درپیش ہے کہ جوائنٹ فیملی میں رہنے والے اساتذہ اور طلبہ گھر میں ہونے والے شور شرابے کے باعث لیکچرز دینے، سننے اور سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔جب کہ یہ بھی دیکھا گیا کہ یونیورسٹیز کی

جانب سے آن لائن کلاسز متعارف ہوتے ہی طلبہ کی جانب سے لیکچرز سمجھ میں نہ آنے کی شکایات، انٹرنیٹ سے متعلقہ کئی مسائل بھی سامنے آئے۔

علاوہ ازیں، والدین اور طلبہ کی جانب سے فیس کی ادائی کے حوالے سے بھی خاصے تحفظات سامنے آئے کہ آن کیمپس تعلیم نہ ہونے اور معیاری تعلیم کی عدم فراہمی کے باوجود فیس میں کسی قسم کی رعایت نہیں دی گئی۔

قارئین! لاک ڈاؤن کی وجہ سے ایک جانب درس وتدریس کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے تو وہیں دوسری جانب پریس اور پرنٹنگ کا کام فی الحال بند ہے۔ اسی بنا پر آپ کا سہ ماہی جرنل ''تاریخ ادب اردو'، دہلی بشکل ہارٹ کاپی وقت پر شائع نہیں ہو پا رہا ہے۔ حالانکہ ہمیشہ سے ہماری کوشش یہی رہتی ہے کہ جرنل اپنے مقررہ وقت پر شائع ہو کر آپ حضرات تک پہنچ جائے، لیکن جاریہ عالمی وبا کے سبب وقت پر آپ تک پہنچانے میں ہم قاصر ہیں۔ آیئے ہم سب مل کر دعا کریں کہ اللہ رب العزت ہمیں اور آپ کو اس وبا سے محفوظ رکھے اور اس مصیبت سے ہم سب کو نجات دلائے۔ آمین

دوسری بات یہ ہے کہ کورونا وائرس کی وجہ سے جہاں تمام شعبہ ہائے زندگی متاثر ہے وہیں اموات کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ ایک طرف عام ہندوستانیوں کی جانیں تلف ہوئی ہیں تو دوسری طرف اردو کی بستی میں بھی ماتم اور سوگوار کا ماحول ہے۔ برصغیر کے مشہور فکشن نگار مشرف عالم ذوقی، افسانہ نگار تبسم فاطمہ (ذوقی صاحب کی اہلیہ)، ادیب و دانشور پروفیسر شمیم حنفی، ادبی صحافت میں نمایاں مقام رکھنے والے پروفیسر محمد ظفر الدین، تنقید کے معتبر نام پروفیسر مولا بخش، افسانہ 'گنبد کے کبوتر' کے خالق شوکت حیات، ''نئی صبح'' اور ''اونچی اڑان'' جیسے افسانچے کے موجد ڈاکٹر محمد ابرار الحق (سابق انکم ٹیکس آفیسر دمکا) اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر رضا حیدر اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین۔

مدیر

فرحتِ روح کا شاعر: اصغر گونڈوی

ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا
شعبۂ اردو کروڑی مل کالج
دہلی یونیورسٹی، دہلی

(کلیدی الفاظ: اصغر گونڈوی، بحیثیت، غزل گو، شاعر)

ملخّص

اصغر گونڈوی اردو کے ان چنندہ شاعروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے حسن وعشق کی شاعری کو محض ہجر کی نالہ وزاری، جسم کی لطافتوں اور لذتوں کے بیان یا اس سوز وگداز سے جو عشقیہ شاعری کا لازمہ سمجھا جاتا ہے، دور رکھ کر اک نشاطیہ اور طربیہ لب ولہجہ دیا جو بالکل نیا تھا اور جو پڑھنے والے کو اداس یا غمگین کرنے کی بجائے ایک مسرت افزا کیفیت سے دوچار کرتا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ اس میں لکھنوی شاعری کے اوچھے پن یا تہذیب سے گری ہوئی کسی بات کا شائبہ تک نہیں۔ اصغر کی شاعری اصلاً تصوف کی شاعری ہونے کے باوجود دوسرے صوفی شاعروں مثلاً درد، سراج اورنگ آبادی یا امیر مینائی کی شاعری سے بہت مختلف ہے اور وہ اس طرح کہ ان کی شاعری اس شخص کو بھی جسے تصوف یا صوفیانہ مضامین سے کوئی دلچسپی نہ ہو، سرشار اور محظوظ کرتی ہے، ان کا پیرایہ بیان دلکش، رنگین اور مسرت افزا ہے اور ان کی یہی خصوصیت ان کو دوسرے صوفی شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔ اصغر نے بہت سے دوسرے شعراء کی طرح نال کٹتے ہی ''مطلع عرض ہے''

نہیں کہا بلکہ خاصی پختہ عمر میں شاعری شروع کی اور اس کو دوسروں تک پہنچانے یا مقبول بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ان کا چلتا پھرتا اشتہار بس جگر مرادآبادی تھے جو ان سے اس قدر متاثر تھے کہ ان کی غزلیں جیب میں لیے پھرتے تھے اور ایک ایک کو سناتے تھے۔اصغر کبھی پیشہ ور یا پُر گو شاعر نہیں رہے اور تبھی شعر کہتے تھے جب شعر خود کو ان سے کہلوا لے۔یہی وجہ ہے کہ ان کا جو بھی کلام ہے وہ سارے کا سارا درجہ اوّل کا،رطب و یابس سے پاک اور نفاست سے لبریز ہے۔

....

یوں تو اصغر گونڈوی 1884ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے لیکن والد چونکہ گونڈہ میں ملازمت کرتے تھے اس لیے اصغر صاحب والد کے ساتھ گونڈہ ہی میں بہت دنوں رہے اور یہیں ادب و شاعری سے شغف ہوا،نتیجتاً اصغر سے اصغر گونڈوی بن گئے۔اپنے دور کے رائج زبانوں میں عربی،فارسی،اردو اور انگریزی کی اچھی صلاحیت کے مالک اصغر گونڈوی کو کتب بینی کا بے حد شوق تھا جس نے ان کے ذہنی VISON کو کافی بڑا کر دیا۔شاعری کی شروعات میں عام روایت کے مطابق واجد بلگرامی سے باضابطہ شاعری کے اسرار و رموز سیکھے اور بعد میں امیر اللہ تسلیم سے مشورہ سخن کرنے لگے۔شروع سے ہی طبیعت تصوف کی طرف مائل تھی۔اردو مرکز لاہور سے بذریعہ ملازمت وابستہ ہوئے۔رسالہ ہندوستان کی ادارت بھی سنبھالی 1936ء میں الہ آباد میں انتقال ہوا۔''نشاط روح''اور''سرود زندگی'' میں ان کی شاعری کا سرمایہ جمع ہے جو شائع ہو چکا ہے۔اردو شاعری میں اصغر گونڈوی کا اپنا رنگ متعین ہے۔وہ اپنے مخصوص لب و لہجے کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔فانی کی طرح اصغر کی شاعری میں بھی یاس و حرماں نصیبی کا رنگ دور سے جھلکتا ہے لیکن کلام بوجھل اور خشک نہیں ہے۔

آلام روز گار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اسے غم جاناں بنا دیا

یا

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے

اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہوجائے

اصغر کے کلام میں جہاں مضامین کی بلندی ہے وہیں وہ شاعری میں رعنائی بیان کا خاص خیال رکھتے ہیں حالانکہ ان کے کلام پر یاس کی بدلی چھائی ہوئی ہے لیکن اس کی وجہ صرف اور صرف ان کا فلسفیانہ مزاج ہے جس کی وجہ سے وہ دنیا کی رنگینی سے کسی حد تک دامن بچا بچا کر چلتے نظر آتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر اعجاز حسین:

''اسلوب بیان کے لحاظ سے اصغر سبھوں سے الگ ہیں اور اس میں شک نہیں کہ جہاں تک زبان کا تعلق ہے اتنا غیر تقلیدی اور نرالے انداز تغزل کا نمونہ اردو میں کمیاب ہے''۔

یا پھر راجندر ناتھ شیدا جو اردو کی جدید تنقید میں ایک تسلیم شدہ حیثیت رکھتے ہیں'' اصغر کی شاعری'' کے زیر عنوان فرماتے ہیں۔

''اصغر کی نظر صحیح معنوں میں فنکار کی نظر تھی جو اپنے ماحول کی ہر شئے میں حسن کا معائنہ کرتی تھی انہیں شاید تصوف میں اس لیے بھی دلچسپی تھی کہ انہوں نے وحدۃ الوجود کا فلسفہ پیش کر کے ساری کائنات کو حسن تعلق کا بوقلموں گلدستہ قرار دیا اور گوناں گوں مظاہر کو ساوی تجلیات کے دلفریب رنگوں میں ڈبونے کی کوشش کی''۔

اصغر کو کائنات اور اس کی ہر حسین شئے سے عشق تھا وہ ہر جلوۂ حسن کو اپنے مضطرب سینے سے زیادہ قریب کھینچنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ چیزیں ان کے لیے غیر محدود لذت کا سرچشمہ تھیں۔ ان کا قلم حسن کی کیفیات بیان کر کے رنگینیوں اور مسرت کا ساغر چھلکاتا تھا۔ کیسی دلکش تشبیہ ہے ۔

اس عارض رنگیں پر عالم یہ نگاہوں کا
محسوس یہ ہوتا ہے پھولوں میں صبا آئی

یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ایک دھڑکتا ہوا دل ضرور محسوس ہوتا ہے لیکن روتی ہوئی آنکھیں

کہیں نظر نہیں آتیں اسی لیے وہ خود بھی کہتے ہیں۔

شعر میں رنگینیٔ جوش تخیل چاہیئے
مجھ کو اصغر کم ہے عادت نالہ و فریاد کی

یا

فروش آرزو ہو نغمہ خاموش الفت بن
یہ کیا ایک شیوۂ فرسودۂ آہ و فغا ں برسوں

اصغر رمز جمالیات سے بخوبی واقف تھے وہ نظارہ جمال کو ایک داخلی تجربہ تصور کرتے تھے۔

جلوہ تیرا اب تک ہے نہاں چشم بشر سے
ہر ایک نے دیکھا ہے تمہیں اپنی نظر سے

ان کی نظر میں حسن وعشق ایک ہی شئے کے دو مختلف پہلو ہیں وہ حسن کے ناز اور عشق کے نیاز کے قائل نہیں بلکہ حسن وعشق کی باہمی کشش پر بہت زور دیتے ہیں اور عشق میں بھی حسن کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

محو ہے ذوق دید بھی جلوۂ حسن یار میں
ایک شعاع نور ہے اب یہ نظر نظر نہیں

☆

دید کیا نظارہ کیا اس کی تجلی گاہ میں
وہ بھی موج حسن تھی جس کو نظر سمجھا تھا میں

☆

کتنی پیاری شکل ان پردوں میں ہے جلوہ فروز
عشق کو تر و لیدہ مو آشفتہ سر سمجھا تھا میں

☆

کار فرما ہے فقط حسن کا نیرنگ کمال
چاہے وہ شمع بنے چاہے وہ پروانہ بنے

☆

عشق تھا آپ مشتعل حسن تھا خودنمود پر
میری نظر سے کیا ہوا تیری نظر نے کیا کیا

''شاہدِتصوف'' سے اصغر کی دلچسپی کی وجہ جس کی طرف راجندر ناتھ شیدا نے اپنے خاص فکری تجربات کے ساتھ غور کیا ہے ہمیں ان کی شاعری میں ہی نہیں ان کی عام زندگی میں بھی نظر آتی ہے وہ پختہ مذہبی عقائد کے حامی تھے اور قاضی شاہ عبدالغنی سے انہیں شرف بیعت حاصل تھا۔

اصغر گونڈوی کی شاعری میں جمالیات کا ایک مستقل نظریہ ملتا ہے اور ان کے پورے کلام میں جو نشاط و سرمستی ہے وہ وجدانی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ان کی بڑی خصوصیت خیالات کی یکسانیت یک رنگی وہمواری ہے جو اردو کے دوسرے غزل گو شعرا کے یہاں موجود نہیں۔

راجندر ناتھ ٹید شیدا کے خیال میں:

''ہمہ گیر جمال کے داخلی تصور نے اصغر کی شاعری میں ایک قسم کی انا پیدا کر دی تھی جس نے ان کی شاعری کو روایتی عشق کی دو بدعتوں سے محفوظ رکھا۔ ایک تو یہ کہ وہ کبھی محبوب کے در پر ''سرزیر بارِ منت درباں کئے ہوئے'' پڑے نظر نہیں آتے عظمت عشق کا احساس قدم قدم پر ان کی شاعری کے دھندلکوں سے جھانکتا نظر آتا ہے۔

وہ عشق کی عظمت سے شاید نہیں واقف ہیں
سو حسن کروں پیدا اک ایک تمنا سے
اسرار کی بارش ہو انوار کی ریزش ہو
ساغر کو جو ٹکرادوں اس گنبد مینا سے

یا پھر ان کا وہ مشہور شعر۔

نیاز عشق کو سمجھا کیا اے واعظ ناداں
ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھدی

دوسرے ان کے یہاں رشک رقیب کی خلش اور ناکامیٔ محبت کی نوحہ خوانی ناپید ہے۔اصغر کے عشق کی نوعیت پر غور کرنے سے ان کے جذبات کا تجزیہ کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے ان کی دلکشی کے مراکز غیر محدود ہیں جس میں کسی دوسرے کی شرکت ان کے اپنے جذبات پر کوئی اثر نہیں ڈال سکی ایسی صورت میں احساس رقابت اور رشک وحسد کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔اس کے علاوہ وہ عشق کو تقاضائے فطرت اور عین حیات تصور کرتے ہیں جس سے فرار ممکن نہیں۔اصغر کے عشق کے سامنے مشکل سے حاصل ہونے والے مقاصد نہیں ہیں بلکہ وہ عشق کے ہر تجربے سے لطف اندوز ہونے کو ہی عشق کا مقصد خیال کرتے ہیں۔

حسن کو وسعتیں جودیں عشق کو حوصلہ دیا
جو نہ ملے نہ مٹ سکے وہ مجھے مدعا دیا

☆

کچھ اور عشق کا حاصل نہ عشق کا مقصود
جزایں کہ لطف خلش ہائے نالۂ بے سود

لیکن اسی عنوان پر ڈاکٹر اعجاز حسین کا خیال ہے کہ

''اصغر کی غزلوں میں عاشق ومعشوق کے باہم اختلاف اور ٹھیٹ انسانی جذبات تو بہت کم ملتے ہیں لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ موجودہ غزل گوئی میں اس چیز کا قریب قریب فقدان ہے''

اصغر کی شاعری کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے پیش پا افتادہ مضامین سے علی العلوم گریز کیا ہے اور اپنے خاص طرز بیان سے کلام میں لوچ اور ندرت پیدا کی ہے۔چنانچہ ڈاکٹر اعجاز حسین خاص طور پر ان کے کلام کی اس خوبی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اصغر تشبیہہ و استعارے میں خاص کاوش کرتے ہیں۔ عامیانہ وفرسودہ چیزوں سے گریز کرکے نہایت غور وخوض کے بعد ایسی لطیف و نادر چیزیں پیدا کرتے ہیں کہ بعض لحاظ سے ایسا ذخیرہ ادب میں ایک اضافہ سمجھا جاسکتا ہے''

راجندر ناتھ شیدا نے بھی ان کی اس خصوصیت کا خاص طور پر تذکرہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''ان خصائص سے اردو شاعری میں اصغر کی جو انفرادیت قائم ہوتی ہے اس کے علاوہ بھی ان کے یہاں ایک ایسی صفت موجود ہے جس کے بغیر کوئی شاعری صحیح معنوں میں بلند مرتبہ حاصل نہیں کرسکتی۔ اور وہ صفت ہے جدت اور مشرقی شاعری میں وحدۃ الوجود حالانکہ یہ ایک پامال مضمون ہے لیکن اصغر کے یہاں وہ کس کس پیرائے میں جلوہ گر ہوتا ہے''۔

ہے ایک ہی جلوہ جو ادھر بھی ہے اُدھر بھی
آئینہ بھی حیرا ن ہے اور آئینہ گر بھی

☆

بس اتنے پر ہوا ہنگامہ دارورسن بر پا
کہ لئے آئینہ کیوں آغوش میں مہر درخشاں کو

☆

جو نقش ہے ہستی کا فانی نظر آتا ہے
پر دہ پہ مصور ہی تنہا نظر آتا ہے
لو شمع حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے
فانوس کی گردش سے کیا کیا نظر آتا ہے

☆

سوبار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گر یباں تھا

☆

اس طرح چند لطیف کنائے بھی قابل داد ہیں ؎

جو مجھ پہ گذری ہے شب بھر وہ دیکھ لے ہمدم
چمک رہا ہے مژہ پر ستارۂ سحری

☆

جان بلبل کا خزاں میں نہیں پرساں کوئی
اب چمن میں نہ رہا شعلۂ عریاں کوئی

اصغر کے کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جو انہیں میں دوسرے غزل گو شعرا سے الگ کرتی ہے۔ بقول اعجاز حسین ان کے وہ اشعار خاص طور پر دلکش ہوتے ہیں جن میں غیر رخا اشیا یا کیفیات مجردہ کو روح فرض کر لیا جاتا ہے۔

بہر حال اصغر کے دونوں شائع شدہ مجموعہ ''نشاط روح'' اور ''سرود زندگی'' بہت مختصر ہونے کے باوجود بلند ترین شاعری کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں۔

☆☆☆

جہانِ نو کی تسخیر کا نسخۂ کیمیا

''اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے''

ڈاکٹر محمد نظام الدین
Mob: 9718048854

اقبال رقصِ حیات اور جشنِ کائنات کے نغمہ خواں ہیں۔ وہ شاعری اور دانشوری کی آبرو ہی نہیں بلکہ بنی نوع انسان کے لیے باعث افتخار بھی ہیں۔ ان کی دوررسی اور دوربینی کا کوئی ثانی نہیں۔ اقبال تسخیرِ کائنات کے رازداں ہیں اور انقلابی فکر کے پیامبر بھی۔ وہ انسانیت کی اعلی قدروں کے نقیب ہیں، ساتھ ہی جہانِ نو کے معمار بھی۔ ہماری عظمتِ رفتہ کی بحالی کے لیے فکرمند ہیں اور قوم و نسل کے تابناک مستقبل کے آرزومند بھی۔

''اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے''

اس مصرع کا مرکزی خیال جہد مسلسل، عمل پیہم اور سخت کوشی ہے۔ اس مصرع میں خود مکتفی کی دعوت اور چاہ کنی و آب نوشی کی تلقین بھی ہے۔ خوابیدہ قوم کو بیدار کرنے اور کچھ کر گزرنے کے جذبہ کے ساتھ اس مصرع میں اپنی دنیا آپ بسانے کی ترغیب ہے۔ ژولیدگی اور مایوسی سے ماورا صاحب کمال بننے کی نصیحت بھی ہے۔ اس مصرع میں زندہ قوموں کی کامیابی کا راز اور ان کے امید افزا مستقبل کا مژدہ موجود ہے۔

'خضر راہ' اقبال کی ایک مشہور اور بہترین نظم ہے۔ اقبال کی دیگر نظموں جیسے ساقی نامہ، مسجد قرطبہ، ذوق وشوق، شکوہ اور جواب شکوہ کی طرح 'خضر راہ' بھی ایک معنی خیز اور سبق آموز نظم

ہے۔ یہ نظم اقبال کا پہلا اردو شعری مجموعہ ''بانگ درا'' میں شامل ہے۔ ''بانگ درا'' ربع صدی کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ جسے افہام وتفہیم کے لیے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں وہ نظمیں شامل ہیں جو 1905 تک لکھی گئیں۔اس میں بچوں کے لیے خوبصورت نظمیں اور حب الوطنی کے حوالے سے مشہور 'ترانۂ ہندی' موجود ہے۔ دوسرے حصے میں 1905 سے 1908 کے درمیان لکھی گئی نظمیں شامل ہیں۔ تیسرے حصے میں اقبال نے مسلمانوں کو اپنے عظیم ماضی کی یاد دلائی ہے اور نفرتوں کی تمام سرحدوں سے بالاتر ہوکر ان سے اخوت و بھائی چارے کا مطالبہ کیا ہے۔ مشہور نظمیں شکوہ، جوابِ شکوہ، خضرراہ اور طلوعِ اسلام اسی حصے میں شامل ہیں۔ جو فکر انگیز اور ولولہ خیز خیال پر مبنی ہیں۔

''خضرراہ'' 85 اشعار پر مشتمل ایک آفاقی نظم ہے۔اور چھ حصوں کی ایک مربوط کڑی ہے اور ان حصوں میں باہمی ربط پیدا کرنے کے لیے ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں اور انہیں ایک مرکزی خیال سے مربوط کیا گیا ہے۔ جیسے شاعر، جواب خضر، صحرانوری، زندگی، سلطنت، سرمایہ ومحنت اور دنیائے اسلام۔ جو دوسری طویل نظموں میں کم یاب ہے۔

''زندگی'' خضرِ راہ کا چوتھا بند ہے۔اور اسی بند میں ''اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے'' مصرع اپنی تمام تر شان وشوکت اور بلند پروازی کے ساتھ موجود ہے۔ یہ مصرع اقبال کے دل ودماغ سے اس وقت نکلا تھا جب نہ صرف عالم اسلام بلکہ تمام ایشیائی اقوام کے لیے نازک ترین اور پرآشوب دور تھا۔مغربی قوتیں اپنے توسیع پسندانہ عزائم کی بنیاد پر امنِ عالم کے لیے ایک چیلنج بن چکی تھیں۔ آج کے دور میں اس مصرع کی معنویت اس وجہ سے بڑھ جاتی ہے کہ پوری مغربی دنیا کی شاطرانہ نگاہیں مشرق وسطیٰ پر مرکوز ہیں۔ اور اپنے مفاد کی خاطر آپسی خانہ جنگی کے لیے سازشیں رچ رہی ہیں۔ مسلم قوم اور مشرق وسطیٰ کی بدترین صورتحال اقبال کے دور میں بھی تھی اور آج بھی مسلم قوم اور مشرق وسطیٰ کے حالات سنگین ہیں۔ آخر برق بے چارے مسلم قوم پر ہی کیوں گرتی ہے؟۔ یہ سوال کل بھی اقبال کے ذہن کو جھنجھوڑ رہا تھا اور آج بھی ہمارے دانشوروں کو سوچنے پر مجبور کر رہا ہے۔

پورا بند اس طرح ہے:

برتر از اندیشۂ سود وزیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہردم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ وسنگِ گراں ہے زندگی
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم
آب اور آزادی میں بحر بے کراں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی
خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا ایک انبار تو
پختہ ہوجائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

آگے اقبال کہتے ہیں:

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین وآسمانِ مستعار

اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
خاک مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب
تابدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے
سوئے گردوں نالۂ شب گیر کا بھیجے سفیر
رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے
یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

اقبال کے نزدیک زندگی ایک مسلسل حرکت کا نام ہے۔ جونئی خواہشات کو جنم دیتی ہے۔اور ان خواہشات کی تکمیل کے لیے انسان کو اکساتی ہے۔زندگی پیہم عمل ہے اور کش مکش سے نبرد آزما ہوتی ہے۔اس لیے اقبال انسانوں کو عمل اور جہد مسلسل کا پیغام دیتے ہیں۔اور وہ سکوت کو موت سے تعبیر کرتے ہیں۔

اقبال انسانی زندگی کو موہوم نہیں بلکہ موجود سمجھتے ہیں۔کائنات وہمی نہیں بلکہ وجودی شئے ہے۔ارتقا کا عمل مسلسل جاری ہے۔یہی مسلسل حرکت اور پیہم جستجو وہ چیز ہے جو انسان کو باقی کائنات سے ممتاز کرتی ہے۔اقبال خوب سے خوب تر کی جستجو میں ہر لحہ نئی خواہشات اور نئی دنیا آباد کرنے کے قائل ہیں۔وہ زندگی کو عمل کا مظہر دیکھنا چاہتے ہیں۔وہ حوادث سے بے خبر ہوکر فطرت کی تسخیر کو انسانی عظمت کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نئی نسل اور نوجوان ہی کسی بھی قوم کے جوہر اور بیش بہا سرمایہ ہوتے ہیں۔اگر نئی نسل اور نوجوانوں میں دلیری، استقلال اور عزم مصمم ہو تو وہ کسی بھی پہاڑ اور چٹان سے ٹکرانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔کیونکہ ملک کی ترقی، خوشحالی اور تابنا کی کا انحصار انہیں پر ہوتا ہے۔اقبال نے جہاں ایک طرف خودی اور مرد کامل کو اپنے کلام کا موضوع بنایا ہے تو وہیں دوسری طرف اپنے کلام میں امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز نئی نسل اور نوجوانوں کو بھی قرار دیا ہے۔

''اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے''

اس مصرع سے اندازہ ہوتا ہے کہ نئی نسل اور نوجوان ہی اقبال کے اصل مخاطب ہیں۔ یوں تو ان کی پوری شاعری ایک خاص مقصد اور پیغام سے لبریز ہے۔لیکن اقبال نے جن نظموں میں خاص طور پر نئی نسل اور نوجوانوں کو خطاب کیا ہے۔ان میں ''خطاب بہ جوانانِ اسلام، ایک نوجوان کے نام، جاوید کے نام، جاوید سے، عبدالقادر کے نام، صدائے غیب، بزم انجمن، شاہین، ذوق وشوق، پیام مشرق، مسجد قرطبہ، ساقی نامہ، نصیحت، دعاء، زمانہ، نوید صبح اور سلطان ٹیپو کی وصیت'' وغیرہ اہم ہیں۔

اس خیال کی دوسری تعبیر میں اقبال اپنے صاحبزادے جاوید کے وسیلے سے یہ پیغام دیتے ہیں:

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح وشام پیدا کر

اقبال کے کلام میں جگہ جگہ عمل کی تلقین ملتی ہے۔وہ کہتے ہیں مقاصد کتنے ہی بلند کیوں نہ ہو عمل کے بغیر بے معنی ہوتے ہیں۔انسان کی شخصیت عمل ہی کے ذریعہ بنتی ہے۔نیکی کوئی خودساختہ شی نہیں ہے بلکہ عمل سے جنم لیتی ہے۔اسی طرح زندگی کی تشکیل اور شخصیت کی تعمیر میں عشق وعمل کے ساتھ غیرت اور خودی بھی اہم عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں اور اقبال نے انہی صفات کو حیات وکائنات کا اصل جوہر قرار دیا ہے۔

اقبال کی شاعری میں یہ خیال بہت ہی فکر انگیز ہے، بلکہ اساسی نکتہ جوان کی فکر کی ترجمانی کی ایک بڑی علامت کے طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے،اس خیال کو اقبال نے جگہ جگہ اپنے اشعار میں پوری توانائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔مذکورہ مصرع میں اقبال نے اسی خیال کو پیش کیا ہے۔جو اپنی دنیا خود تعمیر کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ایک جگہ اقبال نے مانگی ہوئی جنت کو تسلیم کرنے سے بھی انکار کیا ہے۔جسے انہوں نے بڑی قوت ارادی کے ساتھ بیان کیا ہے۔یہی خیال

کم وبیش کے ساتھ بال جبریل کی غزل کے مشہور شعر میں بھی پیش کیا ہے۔

''کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر''

بالِ جبریل کی غزل اس اساسی خیال کا تکرار بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔''تیرا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد'' گویا اس خیال کی فکر انگیزی سے اقبال کا کلام بھرا پڑا ہے۔جس کو کہیں انہوں نے 'راز کن فکاں' کہا ہے اور کہیں 'کل یوم فی شان' کہہ کر اپنی فکر کو علامتوں کے پردے میں پیش کیا اور کہیں یہ کہا کہ اگر زمانہ تمہارا ساتھ نہ دے تو زمانے کو بدل کر رکھ دو یا گردش آسماں اگر سازگار نہ ہو تو اس سے بے نیاز ہو جاؤ اور نظامِ فلکی کو بدل دو۔یہی نہیں اس عشق کی انقلابی روح ان کی تمام تر شاعری میں بکھری پڑی ہے۔ پیام مشرق میں مشہور انقلابی نظموں میں وہ بیداری کو تعمیر کے لیے منسوب کرتے ہیں۔ یہ دونوں فقرے جو اس نظم میں وارد ہوئے ہیں۔''معمارِ جہاں خیز'' یا ''تعمیر جہاں خیز'' اسی موضوع کی تفسیریں ہیں۔ جو اقبال کی فکر کا بنیادی عنصر ہے۔ان کی اس احتجاجی آواز میں جو سب سے بڑا طوفان خیز پیغام ہے وہ اس دنیا کو تہس نہس کر دو ہے۔کیونکہ یہ مانگی ہوئی دنیا ہے جو ہمارے لیے قطعی طور پر ناسزاوار ہے۔اقبال کہتے ہیں:

پھونک ڈالے یہ زمین وآسمان مستعار

اورخاکستر سے آپ اپنی جہاں پیدا کرے

زیر بحث مصرع کی آخری منزل یہ مذکورہ شعر ہے۔دوسرے لفظوں میں جس کو ہم اپنے خون جگر سے نہ حاصل کریں وہ ہمارے لیے حرام ہے۔مرد مومن اور شاہینی صفات میں بھی اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

خریدیں نہ جس کو ہم اپنے لہو سے

مسلماں کو ننگ و پاد شاہی

اور

'شکار مردہ سزاوار شاہباز نہیں'

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ یہ خیال جو 1922/23ء میں 'خضر راہ' میں قلمبند کیا گیا ہے، ان کی فکر کی انمول احساس ہے اور پیغام بھی۔ اسے دوسرے زاویے سے بھی دیکھنا مناسب ہوگا کہ اس نظم کی تخلیق کا سبب انقلابِ روس ہے اور اقبال کو آفریں ہو کہ وہ پہلے ہندوستانی شاعر یا مفکر ہیں جنہوں نے انقلابِ روس (1917) سے متاثر ہو کر یہ انقلابی نظم بند کی۔ اور اس نظم کی روح یہی انقلابی مصرع ہے، جو ان کے سرچشمہ خودی کا لازمی جزو ہے۔ کیونکہ خودی احساس کا نام ہے، جو نظر سے اوجھل ہے۔ یہ خودی جب تعمیر و تخلیق کا جوہر دکھاتی ہے تو یہ احساس مادی اور ظاہری شکل وصورت میں وجود حاصل کرتی ہے۔ جس سے دنیا کی تخلیق کے ساتھ مظاہر اور انسانوں کی بنائی ہوئی بستیاں آباد ہوتی ہیں۔ اقبال نے بڑی خوبصورت بات کہی ہے۔ اینٹ پتھروں سے دنیا نہیں بنتی جہانِ تازہ کی بنیاد افکارِ تازہ سے ہوتی ہے۔ اور فکر و عمل کو مہمیز کرتا ہے تو خارجی وجود ظاہر ہوتے ہیں۔ گویا خودی جو غیر مرئی ہے وہ مرئی شاہکار کا وجود حاصل کرتی ہے۔ اس مصرع میں یہ نکتہ بھی ہے کہ یہ تعمیر و تخلیق پر مبنی ہے۔ اس لیے دنیا کی تخلیق کے لیے خالقِ کائنات نے 'کن' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اقبال نے بھی دوسرے مصرع میں 'ضمیر کن فکاں' کہا ہے۔ گویا اقبال انسان کی صفتِ تخلیق کو آواز دے رہے ہیں۔ تاکہ انسان نیابت الٰہی کا حق ادا کر سکے، جو ان کے فلسفۂ خودی کا ایک محترم موضوع ہے۔ صفاتِ الٰہیہ کی ایک بڑی خصوصیت قوت تخلیق ہے۔ اور انسانی نیابت کے لیے ضروری تھا کہ محدود پیمانے میں انسانوں کو بھی تخلیق کے لیے برسرِ پیکار رہنے کی دعوت دی جائے، قدرت نے جو مظاہر تخلیق کیے ہیں۔ انسان کا انہی پر تکیہ کر لینا محرومی ہوگی۔ جب تک وہ اپنے لیے خود نئی دنیا کی تعمیر نہ کرے۔ یہی تخلیق کا فکری پیغام ہے، جو اقبال کو مضطرب رکھتا ہے۔ اس پہلو سے اقبال کا فن ہو یا ان کا فلسفہ جذبۂ تخلیق کے امکانی سرحدوں تک پرواز کرتا ہے۔ اقبال کو لذت پیدائی سے عشق کی حد تک رغبت ہے۔ کئی جگہوں پر انہوں نے لذت یکتائی و لذت پیدائی کو پیش کیا ہے۔ جس کی آخری منزل وہ بے کراں وسعت ہے جہاں مردِ آفاقی بھی گم نہیں ہوتا بلکہ حکمراں ہوتا ہے۔

'سمانہ سکا دوعالم میں مردِ آفاق'

ان کے علاوہ اقبال ان دنیاؤں کو پیدا کرنے کے آرزومند ہی نہیں بلکہ امادگی سے ہمیں نوازا ہے۔ جو ابھی عالم امکاں میں زیر وجود ہے۔ اسی مصرع کی بلاغت کو دیکھتے ہوئے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ان کے فلسفہ وفکر کی یہ روح ہے یا حاصلِ حیات۔

☆☆☆

کورونا وائرس: ایک مضر اور مہلک وبا

ڈاکٹر شیریں فاطمہ
کوٹہ (راجستھان)

(کلیدی الفاظ: کورونا وائرس / عالمی جنگ)

ملخص

کورونا وائرس ایک عالمی اور قدرتی وبا ہے، جس کی زد میں پوری کائنات ہے۔ ابھی تک اس وبا کی تخصیص نہیں ہو پائی ہے اور نہ ہی اس کے علاج کے لیے کوئی کامیاب نسخہ وجود میں آیا ہے۔ البتہ میڈیکل سائنس کے ماہرین اس وبا کی جڑ تک پہنچنے کے لیے ہمہ وقت تگ و دو میں لگے ہوئے ہیں۔ اس وبا سے بچنے کے لیے دنیا کی سرکاریں طرح طرح کی تدابیر اپنا رہی ہیں تا کہ انسانی جانوں کا نقصان نہ ہو۔ کہیں لاک ڈاؤن کیا جا رہا ہے تو کہیں کرفیو۔ ہمارا ملک ہندوستان بھی اس وبا کی زد میں ہے۔ پہلی لہر میں ہندوستان میں کم اموات ہوئی تھیں لیکن دوسری لہر میں چاروں طرف قیامت بپا ہے اور ہر جگہ سے موت کی خبریں آ رہی ہیں۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ دوسری لہر میں اردو کی بستی میں بھی سوگوار اور ماتم کا ماحول ہے۔

کورونا وائرس کی وبا کے خطرناک نتائج کے پیش نظر ہندوستان میں پہلی بار لاک ڈاؤن نافذ ہوا۔ پہلی بار مارچ 2020 میں پورے ملک میں مکمل طور پر لاک ڈاؤن ہوا۔ کورونا کی دوسری لہر میں ہر ریاست نے اپنے اپنے طریقے سے اپریل 2021 سے لاک ڈاؤن لگانا شروع کر دیا۔ اس لاک ڈاؤن کا اثر پورے ملک کے ہر خطے میں نظر آتا ہے۔ معاشی تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ

لاک ڈاؤن سے ملک کو معاشی نقصان سے نپٹنے میں ایک سال سے زیادہ وقت لگ سکتا ہے۔

یہ بڑے پیمانے پر کہا جا سکتا ہے کہ لاک ڈاؤن نے نہ صرف ملک کو معاشی بحران میں لایا ہے بلکہ اس نے عام آدمی کی سوچ، طرزِ عمل، کام کرنے کے انداز اور یہاں تک کہ پڑھنے پڑھانے کے نمونے تک بدل ڈالے۔

کورونا وائرس وبا پھیلنے کے بعد ہر ملک نے اپنی سرحدوں کو مکمل طور پر یا جزوی طور پر بند کر دیا۔ لوگوں کی آوا جاہی کو روکنے کے لیے ۲۵ ہزار سے زائد قواعد بنائے گئے ہیں لیکن اس پابندی کی قیمت بہت بھاری پڑ رہی ہے۔ لاکھوں لوگ بے روزگار ہو گئے ہیں۔ لاکھوں نوکریاں ختم ہو گئی ہیں۔ لاکھوں تارکینِ وطن پھنسے ہوئے ہیں۔ لوگ فاقہ کشی کے شکار ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگ تو بھیک مانگ رہے ہیں۔

کورونا وائرس کی وجہ سے پوری دنیا میں لاک ڈاؤن کا اثر صرف معاشی نقصانات تک ہی محدود نہیں ہے۔ بہت ساری تحقیقات سے انکشاف ہوا ہے کہ لاک ڈاؤن کی وجہ سے لوگوں کی ذہنی صحت متاثر ہوئی ہے۔ گھریلو تشدد کے واقعات میں اضافے کی اطلاعات دنیا کے تقریباً ہر ملک سے سامنے آئی۔ ایک تحقیق سے یہ سامنے آیا کہ لاک ڈاؤن بچوں پر پوری زندگی کے لیے اثر ڈال سکتا ہے۔ لاک ڈاؤن کا بچوں کی ذہنی اور جسمانی صحت پر برا اثر پڑا ہے۔

کورونا وائرس کے اثرات کو روکنے کے لیے ملک بھر میں لاک ڈاؤن نافذ کیا گیا۔ لیکن اس کا براہِ راست اثر ہندوستان کے غریبوں اور مزدوروں پر پڑا۔ ماضی میں جس طرح سے ملک بھر میں مزدور نقل مکانی کرتے دیکھے گئے وہ اس ملک کی زمینی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے۔

آیئے جانتے ہیں کہ ان چند مہینوں میں کورونا وائرس کے بحران، لاک ڈاؤن اور معاشرتی دوری نے عام آدمی کی زندگی کو کتنا متاثر کیا ہے۔

....

کورونا، کورونا، کورونا ایک ایسی وبا جس کا نام سنتے سنتے ہم تھک گئے ہیں، لیکن یہ وبا ہے کہ ختم

ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے۔ایک شہر نہیں ،ایک ملک نہیں یہ تیزی سے پوری دنیا میں پھیلتی چلی گئی۔اور پوری دنیا پر اثر انداز ہوگئی۔اس نے صرف انسانی جسموں کو ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کیا ہے۔دلوں میں موت کا خوف ایسے بھر دیا کہ انسان انسان سے ڈرنے لگا۔ہر شخص ایک دوسرے سے دوریاں بڑھانے لگا۔چیزوں کو چھونے میں ڈرنے لگا۔سفر کرنے میں ڈرنے لگا۔حتی کے گھر سے باہر نکلنے میں بھی ڈرنے لگا۔اس وبا نے بازاروں کی رونقیں چھین لی،شہر کے شہر ویران کر دیئے۔چاروں طرف صرف سنّاٹا پسرنے لگا۔کئی زندگیاں اس نے لے لی۔کوئی بیماری سے مر گیا تو کوئی خوف سے۔لاکھوں گھر اس نے تباہ و برباد کر دیئے۔

کورونا پھیلنے کی اصل وجہ:۔

اب تک کے ملے ثبوتوں میں یہ صاف ظاہر ہوتا ہے۔کہ کورونا وائرس جنگلی جانوروں سے انسانوں کے درمیان پھیلا ہے۔کوویڈ ۱۹ کے ابتدائی ذرائع چمگادڑ۔یہ ان سے پینگولن جانور کے ذریعے انسانوں میں آیا ہے۔لوگ صحتمند رہیں اس یقین کے ساتھ چین میں لوگ نایاب اور اجنبی جانوروں کو ذائقہ لے کر کھاتے ہیں۔یہ عادت موجودہ وبا کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

۱۹۷۰ء میں چین میں انتہائی غربت تھی۔غریب کسانوں کو سال میں ایک بار گوشت نصیب ہوتا تھا۔اس وقت کسان جنوب مغربی یونان صوبہ میں شتایو کی غاروں سے چمگادڑ پکڑ لاتے تھے۔شتایو کے قریب ووہن وائرولوجی انسٹیوٹ کی ہیڈ سائنسداں شی ژنیگلی نے ۲۰۱۱ء اور ۲۰۱۲ء میں چمگادڑ سے ''این کورونا'' کو الگ کیا۔اس کے ذریعے ہی سارس پھیلا تھا۔شی کے مطابق موجودہ کورونا وائرس اسی خاندان کا ایک حصہ ہے۔شی کی تحقیق سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کوویڈ۔۱۹ (Covid-19) چمگادڑ سے نکلا ہے۔

''اب تک کے ہوئے مطالعوں سے یہ نتیجہ سامنے آیا ہے کہ چمگادڑ میں موجود وائرس پینگولن سے ہو کر انسانوں میں داخل ہوا۔ایشیا اور افریقہ کے جنگلوں سے ہر سال ۲۷ لاکھ پینگولن پکڑے جاتے ہیں۔ان میں سے زیادہ تر غذا کے لیے چین پہنچتے ہیں۔چین میں بہت سے لوگ یہ

مانتے ہیں کہ پینگولن کے گوشت سے گٹھیہ جیسے کئی امراض کا علاج ممکن ہے۔ووہان میں ہونان سی فوڈ بازار میں کئی کاروباریوں اور کام گروں کو انفیکشن ہونے پر وائرس کی اصل جڑ سامنے آ گئی۔اس بازار میں پینگولن بھی بکتے ہیں''۔

(Dainik Bhasker Rasrang 02-08-2020)

چین سے یہ وائرس ایک ملک سے دوسرے ملک، دوسرے سے تیسرے اور اس طرح تیزی سے پوری دنیا میں پھیل گیا۔ ہمارے ملک میں کروڑوں سے زیادہ لوگ اس کی زد میں آ چکے ہیں۔

کورونا کی علامات:۔

کورونا وائرس کی وجہ سے سانس کی نالی میں ہلکہ انفیکشن ہو جاتا ہے۔جیسا کے عام طور پر سردی زکام میں دیکھا جاتا ہے۔حالانکہ اس بیماری کی علامت بہت عام ہے۔کوئی شخص کورونا وائرس کا شکار نہیں ہے تب بھی اس میں اس طرح کی علامت دیکھی جا سکتی ہے۔جیسے:

۱۔بہتی ناک

۲۔سر میں شدید درد

۳۔خشک کھانسی

۴۔تھکاوٹ اور متلی محسوس کرنا

۵۔سانس میں کمی

۶۔نمونیا

۷۔برونکائٹس

ملک میں کورونا کی جانچ کے لیے الگ الگ ٹیسٹ کیے گئے۔ چار طرح کے کورونا ٹیسٹ کیے گئے انہیں سے معلوم ہوا کہ کوئی پازیٹو ہے یا نیگیٹو۔

۱۔ آر.ٹی.پی.سی.آر (RTPCR)

۲۔ ٹونیٹ یا سی بی نیٹ ٹیسٹ

۳۔ ریپڈ اینٹیجن ٹیسٹ

۴۔ ریپڈ اینٹی باڈی ٹیسٹ

۱۔ آر.ٹی. پی.سی.آر(**RTPCR**)

رئیل ٹائم پولمریس چین ریکشن یہ ٹیسٹ صرف لیب میں ہوتا ہے۔ایک ٹیوب کی مدد سے گلے اور ناک سے سواب لیتے ہیں۔۱۰ اسکنڈ میں یہ عمل مکمل ہو جاتا ہے۔اس کے بعد رائبو نیوکلک ایسڈ ایکسٹریشن مشین کے ذریعے آر.این.اے(RNA) نکالتے ہیں۔سواب سے آر.این.اے نکال کر اس کا ٹیسٹ کیا جاتا ہے اور یہ عمل میڈیکل لیب میں مکمل ہوتا ہے۔آر.ٹی. پی.سی.آر مشین میں آر.این.اے اور ریجینٹس ڈالے جاتے ہیں۔ڈیڑھ گھنٹے میں معلوم ہوتا ہے کہ آر.این.اے میں وائرس ہے یا نہیں۔اس ٹیسٹ کے نتیجے آنے میں ۱۲ سے ۱۶ گھنٹے لگتے ہیں۔اور یہ ۷۵ سے ۸۰ فیصدی قابل اعتماد ہے۔

۲۔ ٹونیٹ یا سی بی نیٹ ٹیٹ

یہ چپ بیسڈ آر.ٹی. پی.سی کٹ(Kit) ہے۔اس میں عام طور پر ٹی.بی اور ایچ.آئی.وی کی جانچ ہوتی ہے۔اس میں گلے اور ناک سے سواب لیتے ہیں۔نیوکلک ایملیفائڈ ٹیسٹ سے کورونا ای.زین جانچتے ہیں۔ٹیسٹ پازیٹو ہو تو آر.ٹی. پی.سی.آر ٹیسٹ کرتے ہیں۔اس کا نتیجہ آنے میں غالباً ۲ سے ۳ گھنٹے کا وقت لگتا ہے۔یہ ۶۰ سے ۷۰ فیصدی مریضوں میں انفیکشن کے امکان ظاہر کرتا ہے۔

۳۔ ریپڈ اینٹیجن ٹیسٹ

کسی علاقے میں کورونا پازیٹو کیس آنے پر وہاں اس کا پھیلاؤ دیکھنے کے لیے اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔خون یا سواب کے نمونے کا ٹیسٹ کیا جاتا ہے۔سواب ناک سے لیا جاتا ہے۔نمونے کو کِٹ میں موجود کیمیکل میں ڈبویا جاتا ہے۔پھر اس کا مائع ٹیسٹ سے وائرس کی موجودگی کو جانچا جاتا ہے۔اس ٹیسٹ کا نتیجہ آنے میں ۲۰ سے ۴۰ منٹ لگتے ہیں۔۳۰ سے ۴۰

فیصدی معاملات میں یہ انفیکشن نہیں پکڑ پاتا۔ٹیسٹ نیگیٹو ہو پھر بھی علامات دیکھے جائیں تو آر.ٹی.
پی.سی.آر ٹیسٹ ضروری ہے۔

۴۔ **ریپڈ اینٹی باڈی ٹیسٹ**

یہ کورونا ٹیسٹ نہیں ہے۔صرف یہ جانچ کرتا ہے کہ وائرس کا این ٹی باڈی جسم میں ہے یا نہیں۔خون کے نمونے میں موجود اینٹی باڈی کی جانچ کی جاتی ہے۔کورونا میں آئی جی ایم (IGM) این ٹی باڈی انفیکشن کے دوران بنتا ہے۔آئی جی ایم ٹھیک ہونے کے بعد اس ٹیسٹ کا نتیجہ آنے میں ۱۵ سے ۲۰ منٹ لگتے ہیں۔اس کا استعمال آبادی میں انفیکشن کی سطح کو دیکھنے کے لیے کیا جاتا ہے۔انفیکشن اگر بہت ہلکے ہوں تو نتائج غلط ہو سکتے ہیں۔

(Dainik Bhasker 09-08-2020 Page No.13)

کورونا کیسے ہوتا ہے؟

ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (WHO) کے مطابق کسی متاثرہ شخص کے کھانسنے اور چھینکنے سے نکلے تھوک کے باریک ذرات ہوا میں پھیل جاتے ہیں۔ان ذرات میں کورونا وائرس ہوتا ہے۔
متاثرہ شخص کے قریب جانے پر یہ وائرس سانس کے ساتھ آپ کے جسم میں داخل ہو سکتے ہیں۔

انسان کے جسم میں پھیپھڑے وہ جگہ ہے۔جہاں سے آکسیجن جسم میں پہنچتا ہے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ جسم سے باہر نکلتا ہے۔لیکن کورونا کے تیار کردہ چھوٹے چھوٹے ایئر سک میں پانی جمنے لگتا ہے۔اور اس وجہ سے سانس لینے میں تکلیف ہوتی ہے۔اور مریض لمبی سانس نہیں لے پاتے۔ایسے میں مریض کو وینٹیلیٹر کی ضرورت پڑتی ہے۔کئی بار اس بات کو سنجیدگی سے نہیں لینے پر موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔

ابھی تک کورونا وائرس سے بچاؤ کی ویکسین نہیں بنی ہے لیکن امریکہ سمیت دگر ملکوں کے ڈاکٹرز لگاتار تحقیق کر رہے ہیں۔امید کی جا رہی ہے کہ جلد ہی اس کی ویکسین تیار ہو جائے گی۔
ہندوستانی ڈاکٹر بھی اس سلسلے میں کوشش کر رہے ہیں۔

کورونا وائرس کی احتیاتی تدابیر

اپنے آپ کو کورونا وائرس سے بچاؤ کے لیے حفظان صحت کا مکمل خیال رکھیں۔اس کے علاوہ عالمی ادارہ صحت (WHO) نے کچھ حفاظتی اقدامات تجویز کیے ہیں۔انہیں اپنانے سے کورونا وائرس سے بچا جا سکتا ہے۔

☆ کورونا وائرس کے انفیکشن سے بچنے کے لیے اپنے ہاتھوں کو سینیٹا ئزر یا پھر ہینڈ واش اور صابن سے کم سے کم ۲۰ سیکنڈ تک ہاتھ دھوئیں۔

☆اس سے بچنے کے لیے جب باہر سے گھر واپس آئیں تو پہلے اچھے سے اپنے ہاتھ دھوئیں۔

☆اگر گھر سے باہر ہیں تو سینیٹا ئزر اور ماسک کا استعمال کریں۔

☆اگر آپ کو کھانسی یا زکام ہے تو ماسک پہنے اور چھینکتے وقت اپنے منھ کو ٹیشو پیپر سے ڈھانپے۔تا کہ کوئی دوسرا شخص اس سے متاثر نہ ہو۔

☆استعمال شدہ ٹیشو کو فوری طور پر ڈسٹبن میں ڈالیں اور اپنے ہاتھ دھولیں۔

☆ کھانسی یا نزلہ زکام کے شکار شخص سے گفتگو کرتے وقت یا اس سے ملتے وقت اس سے تقریباً ایک میٹر یا ۶ فٹ کا فاصلہ رکھیں۔

☆WHO کے مطابق اگر آپ کسی جگہ کو چھوتے ہیں تو یہ ہوسکتا ہے کہ اس میں وائرس موجود ہوں لہٰذا اپنے ہاتھ ناک، کان، آنکھوں اور منھ پر نہ لگائیں۔

☆ یہاں تک کہ شفاخانوں میں ایسے وارڈوں میں نہ جائیں جہاں کورونا کے مریض موجود ہوں۔ اگر شفاخانہ یا کلینک میں کام کرتے ہوں تو ماسک ضرور لگائیں۔

☆اگر آپ کو زیادہ تکلیف یا پریشانی ہورہی ہے تو گھر میں ہی رہیں۔اس کے علاوہ اگر آپ کو بخار، کھانسی، زکام ہے یا سانس لینے میں پریشانی ہورہی ہے تو فوری طور پر اپنے ڈاکٹر سے رابطہ کریں۔

☆اگر آپ کورونا وائرس سے بچنا چاہتے ہیں تو صرف پکا ہوا ہی کھانا کھائیں۔

کورونا وائرس کے چلتے پھیلی افواہیں

ایک خبر کے مطابق اٹلی دنیا کا پہلا ملک بن گیا ہے۔جس نے ایک کووڈ.۱۹ سے مردہ جسم پر اٹوپسی (پوسٹ مارٹم) کیا۔اور ایک وسیع تحقیقات کے بعد یہ پتہ لگایا ہے کہ وائرس کی شکل میں کووڈ.۱۹ موجود نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب کچھ ایک بہت بڑا عالمی گھوٹالہ ہے۔ لوگ اصل میں ایمیلیفائڈ گلوبل ۵جی ایلیکٹر ومیگنیٹک ریڈیئشن (زہر) کی وجہ سے مر رہے ہیں۔

اٹلی کے ڈاکٹروں نے (WHO) کے قانون کے خلاف ورزی کی ہے۔جو کہ کورونا وائرس سے مرنے والوں لوگوں کے مردہ جسم اٹوپسی کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔تا کہ کسی طرح کی سائنسی تحقیق وتفتیش کے بعد یہ پتہ لگایا جا سکے کہ یہ ایک وائرس نہیں ہے۔ بلکہ ایک جراثیم ہے جو موت کا سبب بنتا ہے۔جس کی وجہ سے رگوں میں خوں کی گانٹھیں بن جاتی ہیں۔یعنی اس جراثیم کی وجہ سے خون رگوں اور نالیوں میں جمع ہو جاتا ہے۔اور یہی مریض کی موت کا سبب بن جاتا ہے۔

اٹلی نے اس وائرس کو شکست دی ہے۔اور کہا ہے کہ فیلیا۔انٹراواسکولر کوگولیش تھرونبوسس (Diffuse-Intravascular coagulation(Thrombosis کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور اس کا مقابلہ کرنے کا طریقہ یعنی علاج اینٹی بایئوٹکس دوائیں(Anti biotics tablets)،اینٹی انفلیمٹری(Anti-Inflamentry), اینٹی کا گو لیٹس (Aspirin) کو لینے سے یہ ٹھیک ہو جاتا ہے اور اس بیماری کا علاج ممکن ہے۔دنیا کے لیے یہ سنسنی خیز خبر اطالوی ڈاکٹروں نے کووڈ.۱۹ وائرس سے مردہ جسموں کے اٹوپسی (پوسٹ مارٹم) کر تیار کی ہے۔ کچھ اور اطالوی سائنسدانوں کے مطابق وینٹیلیٹرس اور (ICU) کی بھی ضرورت نہیں تھی۔اس کے لیے اٹلی میں اب نئے پروٹوکال جاری کیے گئے ہیں۔

چین اس کے بارے میں پہلے سے ہی جانتا تھا۔لیکن اس نے اس کی رپورٹ کبھی کسی کے سامنے پیش نہیں کی۔

(ماخذ:اطالوی وزارتِ صحت)

اس خبر کو فرضی بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ (WHO) اس وقت کورونا وائرس سے متعلق اہم معلومات کا دنیا کا سب سے بڑا اور قابلِ اعتماد مرکز ہے۔ سب سے پہلے اس خبر کی تفتیش یہیں سے کرنی شروع کی گئی۔ (WHO) کی ٹیم کورونا وائرس سے افواہوں کی تردید کرتی ہے۔ پہلے ہی یہاں اینٹی بائیوٹک دواؤں کے ذریعے کورونا وائرس کے علاج ہونے کی بات کو غلط بتایا جاچکا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ کووڈ.۱۹ وائرس ہی ہے۔ وہیں پریس انفارمیشن بیورو (PIB) نے بھی اس خبر کو حقائق کے ساتھ جانچا اور پرکھا ہے۔ اور اسے فرضی قرار دیا ہے۔ بین الاقوامی خبروں کو نشر کرنے والے بڑے پلیٹ فارم پر ایسی کوئی تازہ کاری نہیں ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ اٹلی نے کورونا وائرس کو جراثیم کی حیثیت سے رپورٹ کیا گیا ہے۔ اور اس نے اینٹی کا گولٹس (Aspirin) سے اس کے علاج کی تصدیق کی ہے۔

(Asia News Net, New Delhi Dated 05-06-2020)

☆وبا کے اثرات☆

☆کورونا کی وجہ سے لاکھوں تارکینِ وطن بے روزگار

کورونا وائرس وبا پھیلنے کے بعد ہر ملک نے اپنی سرحدوں کو مکمل طور پر یا جزوی طور پر بند کر دیا۔ لوگوں کی آواجاہی کو روکنے کے لیے ۲۵ ہزار سے زائد قواعد بنائے گئے ہیں لیکن اس پابندی کی قیمت بہت بھاری پڑ رہی ہے۔ لاکھوں لوگ بے روزگار ہو گئے ہیں۔ لاکھوں نوکریاں ختم ہوگئی ہیں۔ لاکھوں تارکینِ وطن میں پھنسے ہوئے ہیں۔ نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ کچھ لوگ تو بھیک مانگ رہے ہیں۔ ایسے کئی لوگوں کو متحدہ عرب امارات میں گرفتار کیا گیا۔ ہجرت کی پالیسی کسی بھی ملک کا بنیادی ایجنڈا نہیں ہے۔

وائرس کے پھیلنے کے پیشِ نظر آنے والے وقت میں یہ ناممکن لگتا ہے کہ ویکسین کی ایجاد اور وبا پر قابو پانے کے بعد بھی مختلف ممالک غیر ملکیوں کو قبول نہیں کریں گے۔ لوگ بیماری کے علاوہ خوف کے شکار ہیں۔ بہت سے لوگ غیر ملکیوں کو اس مرض سے وابستہ کرتے ہیں، غیر ملکیوں پر شبہ

کی وجہ سے متعدد ممالک میں چینیوں پر ظلم کیا جاتا ہے۔چین میں افریقی نظر آنے والے افراد کو ہراساں کیا جاتا ہے۔امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے بھی چینی مسافروں پر پابندی عائد کرنے کی بات کہی۔جنوبی افریقہ کی حکومت زمبابوے کی سرحد پر باڑ لگانا چاہتی ہے۔وہاں کے شہروں میں تارکین کی دکانیں بند کر دی گئی ہیں۔ملیشیاء نے روہنگاؤں کی آمد پر پابندی عائد کر دی۔مالدیپ کے آرمی چیف مہاجرین کو ملک کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔بہت سے ممالک میں لوگوں کا خیال ہے کہ باہر کے لوگوں کی وجہ سے مقامی لوگوں کو کام نہیں ملتا۔وہ چاہتے ہیں کہ سفری پابندیوں میں نرمی کے باوجود تارکینِ وطن پر پابندی ضروری ہے۔

دوسرے ممالک کے لوگ ہر ہفتے دبئی کے مضافاتی علاقوں سے باہر جا رہے ہیں اس سال دبئی میں ۱۰ فیصد لوگ کم ہو جائیں گے۔اور امارات میں ملازمت سے محروم ہونے والے ۹۰ فیصد افراد تارکینِ وطن ہیں۔انہیں ملک چھوڑنا پڑ رہا ہے۔ملک سے باہر جانے کے لیے غالباً ۵ لاکھ ہندوستانیوں نے اپنے نام درج کروائے ہیں۔ان میں آدھے سے بھی کم لوگ تو جا بھی چکے۔بین الاقوامی لیبر آرگنائزیشن کے مطابق لاکھوں تارکینِ وطن کو انخلا کیے جانے کا خطرہ ہے۔لاکھوں لوگ ہندوستان، فلپائن اور یوکرین جیسے ممالک میں واپس لوٹ آئے ہیں۔

☆معاشی حالات(Economic Condition)

معاشی حالات کی بات کریں تو ہندوستانی معیشت کو لاکھوں کروڑوں کا نقصان ہوا ہے۔کسی بھی مالیاتی ادارے نے ابھی تک اس کا درست اندازہ فراہم نہیں کیا۔اس کے باوجود ملک کو اب تک ہونے والے نقصان کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ مالی سال ۲۱-۲۰۲۰ میں ایشین ڈولپمینٹ بینک (ADB) نے ہندوستان کی اقتصادی ترقی ۴ فیصدی سے کم ہونے کی اطلاع دی ہے۔جبکہ ایس اینڈ پی گلوبل ریٹنگ کے مطابق جی. ڈی. پی میں ۳.۵ کی شرح نمو ہوئی ہے۔فچ ریٹنگ نے ہندوستان کی نمو کا تخمینہ ۲ فیصدی بتایا ہے۔جبکہ ہندوستان کی درجہ بندی اور تحقیق نے سال ۲۰۲۱ کی پیش گوئی پر نظر ثانی کر کے ۵.۵ فیصد سے ۳.۶ فیصد کر دی ہے۔موڈیز

انویسٹرس سروس نے سال ۲۰۲۰ کے دوران ہندوستان کی جی.ڈی. پی کی نمو ۳.۵ فیصد سے ۲.۵ فیصد کر دی ہے۔ اگر ہم اس بنیاد پر تخمینہ لگائیں تو ملک کی جی.ڈی. پی نمو کی شرح پہلے کے مجوزہ تخمینے سے آدھے یا زیادہ ہو سکتی ہے۔ فی الحال یہ تمام اعداد و شمار تخمینے پر مبنی ہیں۔

کنفیڈریشن آف انڈین انڈسٹری (سی.آئی.آئی) نے حال کے دنوں میں کمپنیوں کے سی.ای.او کا سروے جاری کیا۔ سروے شدہ ۶۵ فیصد کمپنیوں کا خیال ہے کہ اپریل تا جون سہ ماہی میں ان کی آمدنی میں ۴۰ فیصد سے زیادہ کمی واقع ہوگی۔ سروے کے نتائج سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ ملکی معیشت میں سست روی لمبی لمبی ہونے والی ہے۔ سروے میں ۴۵ فیصد سی.ای.او نے کہا کہ لاک ڈاؤن کو ختم کرنے کے بعد معیشت کو معمول میں آنے میں ایک سال سے زیادہ وقت لگے گا۔

☆ آن لائن کلاسیز اور ورک فروم ہوم (Online Classes And Work From Home)

کورونا بحران اور لاک ڈاؤن کا دو مہینوں میں اثر اتنا ہے کہ سرکاری دفاتر تک کا کام کاج کا طریقہ تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ اب آن لائن پلیٹ فارم سے دور رہنے والے عہدیدار، ملازمین، طلباء اور اساتذہ ان کا خوب استعمال کر رہے ہیں۔

لاک ڈاؤن کے باوجود میٹروں شہروں کے اعلیٰ تعلیمی ادارے گھر سے ورک کلاس کے تحت باقاعدہ کلاسوں کی طرح آن لائن کلاسیز چلا رہے ہیں۔ نجی اسکولوں میں آن لائن کلاسیز مقبول ہو گئی ہیں۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اسکول کے بچوں سے لے کر دفتر میں کام کرنے والے بوڑھے ملازمین تک تکنیکی مہارت میں اضافہ ہوا ہے۔

لاک ڈاؤن کی وجہ سے نجی اور سرکاری دفاتر، کارپوریٹ ہاؤسیز، دکانیں، مال، باڈی ریاست سمیت دیگر ادارے بند ہیں لیکن وہ اپنا زیادہ تر کام ورک فروم ہوم کے تحت کر رہے ہیں۔ تمام دفاتر اور محکموں کے آفیسر ویڈیو کانفرنسنگ کے ذریعے کام سنبھال رہے ہیں۔ ای.فائل سسٹم نے ضروری کاموں کے لیے زور پکڑ لیا ہے۔

وزارت عوامی شکایات اور تربیت نے ہوم آف ورک سے متعلق حکومتِ ہند کو ایک نیا

مسودہ پیش کیا ہے۔ جسے آئندہ مہینوں میں تمام محکموں اور وزارتوں کے دفاتر میں لاگو کیا جائے گا۔ اس تجویز کے تحت آن لائن ای آر. پی (ERP) سسٹم ای. فائل، ای. مشمولاتی نظام، واٹس ایپ اور ای میل (E-mail) کے استعمال پر زور دیا جائے گا۔

☆ **لوگوں کے طرزِ عمل میں تبدیلی (Changing People Behavior)**

ایمس (Aims) کے ماہرِ نفسیات راجیش ساگر نے بتایا کہ لاک ڈاؤن کے بعد ان کے پاس کوئی نیا مریض نہیں آیا۔ لیکن پرانے مریض کورونا اور لاک ڈاؤن کے متعلق سوالات پوچھ رہے ہیں۔ لوگوں کا طرزِ عمل بدل رہا ہے۔ ذہن اور سوچ میں ایک نئی تبدیلی آئی ہے۔ منفی خیالات ذہن میں مزید آ رہے ہیں۔ مستقبل کے لیے الجھن اور تشویش پائی جاتی ہے، چڑچڑاپن، افسردہ مزاج، پریشان تنہا ہونے جیسے مسائل ہیں۔ کچھ لوگوں کو باہر جانے کا احساس ہوتا ہے، کچھ لوگ زیادہ سے زیادہ لوگوں سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں راجیش تین مشورے دیتے ہیں۔ (۱) گھر والوں سے بات کریں (۲) اپنے آپ کو ظاہر کریں (۳) اپنے آپ کو مصروف رکھیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بچپن سے ہی شخصیت کی نشوونما ہوتی ہے۔ یہ ہمارے طرزِ عمل، سوچ اور جذبات سے بنا ہے۔ کورونا جیسا ایک مسئلہ تو بدل نہیں سکتا کچھ لوگ متعارف ہوتے ہیں، کچھ ماورائے فراز، کچھ ٹھنڈے اور کچھ گرم مزاج۔ لہٰذا کورونا سے نپٹنے کا طریقہ سب کا مختلف ہے۔ لیکن اگر یہ رجحان ایک طرح سے جاری رہا تو ہمارا سلوک سوچ اور جذبات مستقل طور پر بدل سکتے ہیں۔

☆ **کام کرنے والے مقام کی طلب میں اضافہ (Co-working Space Increased Demand)**

لاک ڈاؤن کے درمیان دفاتر میں اب پہلے کی طرح کام نہیں کریں گے۔ جب آپ لاک ڈاؤن کے بعد دفتر لوٹتے ہیں تو آپ کو سماجی دوری سے بہت ساری اہم تبدیلیوں کی پیروی کرنا ہوگی۔ کمپنیوں نے اس کے لیے تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ کورونا دور میں رونما ہونے والی

تبدیلیوں کے پیش نظر اب آپ کرسی سٹا کر اپنے دفتر میں نہیں بیٹھ سکتے اور نہ ہی اپنی مرضی سے پینسٹری میں کھا پی سکتے ہیں۔اب معاشرتی دوری اور حفظان صحت دفاتر میں کام کرنے کا بنیادی منتر بن گیا ہے۔

کئی کمپنیاں پرانے سیٹ اپ(Set up)میں کام کرنے کے بجائے نئے طور طریقے کو استعمال کر رہے ہیں جیسے کہ Co-working space میں کام کرنے کا آپشن اپنا رہی ہیں۔اس کے پیچھے سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ باہم کام کرنے والی جگہ میں یہ ساری تبدیلیاں کم قیمت پر آسانی اور تیز رفتار کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔

(Patrika News 23-05-2020)

بچّوں پر دگنا بوجھ: وبا کا خوف،افسردگی اور اضطراب کا شکار

کورونا وائرس کی وجہ سے لگے لاک ڈاؤن بچوں کی زندگی پر برا اثر چھوڑ سکتا ہے۔اقوامِ متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق لاک ڈاؤن کے دوران دنیا بھر کے بچوں کو سب سے زیادہ تکلیف ہوئی ہے۔

کورونا وائرس کی وجہ سے پوری دنیا میں لاک ڈاؤن کا اثر صرف معاشی نقصانات تک ہی محدود نہیں ہے۔بہت ساری تحقیقات سے انکشاف ہوا ہے کہ لاک ڈاؤن کی وجہ سے لوگوں کی ذہنی و دماغی صحت متاثر ہوئی ہے۔گھریلو تشدد کے واقعات میں اضافے کی اطلاعات دنیا کے تقریباً ہر ملک سے سامنے آئی۔ایک تحقیق سے یہ سامنے آیا کہ لاک ڈاؤن بچوں پر پوری زندگی کے لیے اثر ڈال سکتا ہے۔لاک ڈاؤن بچوں کی ذہنی اور جسمانی صحت پر برا اثر پڑا ہے۔

اقوامِ متحدہ کی جانب سے اس سلسلے میں جاری کردہ ایک رپورٹ میں بچوں کے بارے میں چونکا دینے والے انکشافات ہوئے۔اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ لاک ڈاؤن کے دوران دنیا بھر کے بچے سب سے زیادہ شکار ہوئے۔یہ حقیقت ہے کہ کورونا وائرس کا اثر بچوں میں کم دیکھا گیا۔لیکن اس وبا سے پیدا ہونے والے مضر اثرات نے براہِ راست بچوں کو متاثر کیا ہے۔کہا جاتا

ہے کہ اس وبا سے بچوں کی ایک بڑی تعداد پر سماجی اور اقتصادی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔اس رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس وبا سے بچوں پر غیر متناسب اثرات مرتب ہوں گے۔یعنی ترقی یافتہ ممالک میں اس کا اثر کم پڑسکتا ہے۔جبکہ متوسط اور کم آمدنی والے ممالک میں اس کا زیادہ اثر ہوسکتا ہے۔اسی طرح ان ممالک میں جہاں پہلے سے ہی بچوں کی فلاح و بہود کی طرف کم توجہ دی گئی ہے۔

لاک ڈاؤن کے دوران ایسے بچوں کے تشدد کا شکار ہونے کا خطرہ بڑھ گیا ہے۔جو غریب خاندان سے تعلق رکھتے ہیں یا پھر جو مہاجر بستیوں میں رہتے ہیں۔یہ بچے جو پہلے ہی زندگی کی مشکلات کا سامنا کررہے ہیں۔نہ صرف غربت کا بحران ہے۔بلکہ تشدد ان کی زندگیوں پر دیرپا غلط اثر چھوڑسکتا ہے۔اقوامِ متحدہ کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ لاک ڈاؤن کے دوران ان بچوں کو بھی خطرہ ہے جو انٹرنیٹ زیادہ استعمال کرتے ہیں۔اس دوران ان کو نامناسب مواد دیکھنے کو مل سکتا ہے۔یا پھر آن لائن ہراساں کے شکار ہوسکتے ہیں۔

اقوامِ متحدہ کی رپورٹ میں دیئے گئے اعداد وشمار کے مطابق لاک ڈاؤن کی وجہ سے بند ہوئی معاشی سرگرمیوں کی وجہ سے دنیا بھر میں قریب ۴ سے ۶ کروڑ بچے غربت کی گرفت میں آجائیں گے۔اس بحران سے پہلے دنیا بھر میں ۴۰ کروڑ بچے انتہائی غربت میں زندگی گزار رہے ہیں۔اس بحران سے نکلنے کے لیے ابھی کوئی حل بھی نظر نہیں آتا۔کیوں کہ لاک ڈاؤن کو کورونا کے خاتمے کے لیے ایک اہم اقدام قرار دیا جاتا ہے۔لیکن اس سے پیدا ہونے والا معاشی نقصان کا اثر نہ صرف بڑوں پر ہورہا ہے۔بلکہ بچے بھی اس کی گرفت میں آجائیں گے۔

لاک ڈاؤن نے بچوں کی تعلیم پر بھی ایک بڑا بحران پیدا کردیا ہے۔دنیا کے تقریباً ۱۸۸ ممالک نے اپنے یہاں اسکول بند کررکھے ہیں۔ایک اندازے کے مطابق اس کی وجہ سے دنیا بھر میں تقریباً ۱۵۰ کروڑ بچوں کی اسکولی تعلیم درہم برہم ہوگئی ہے۔ترقی یافتہ اور ترقی پزیر ممالک میں حکومتوں نے اس کا حل تلاش کرنے کے لیے بچوں کے فاصلاتی تعلیم کے پروگرام شروع کردیئے

ہیں۔لیکن غریب مما لک میں ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔ایک اعداد وشمار کے مطابق غریب مما لک میں صرف ۳۰ فیصد بچے ان خدمات تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ویسے بھی دنیا کے تقریباً ایک تہائی بچے پہلے سے ہی ڈیجیٹل(Digital) دنیا سے واقف نہیں ہیں۔

لاک ڈاؤن کی وجہ سے بچوں کی ذہنی اور جسمانی صحت بھی متاثر ہو رہی ہے۔والدین کی ملازمت چھوٹنے کا اثر بھی بچوں پر پڑ رہا ہے۔مانا جارہا ہے کہ اس لاک ڈاؤن کی وجہ سے بچوں کی اموات کی شرح میں بھی اضافہ ہوگا۔پچھلے سال کی گئی کوششیں شاید اس سال ضائع ہو جائیں گی۔سب سے مشکل بات یہ ہے کہ بچوں کی اموات کی ایک بڑی تعداد کو شمار بھی نہیں کیا جا سکے گا۔کیوں کہ غریب مما لک میں کورونا کی وجہ سے دوسرے امور کی طرف توجہ دینا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

(News.18, 23-05-2020 Google)

تعلیم کا ہائبرڈ ماڈل

کورونا کی وجہ سے تعلیم کے شعبے کو غیر یقینی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔اسکول، یونیورسٹیاں اس مشکل وقت میں جدو جہد کر رہی ہیں۔بہت سے ادارے بند ہیں۔کچھ دور دراز سے کام کر رہے ہیں اور کچھ نے آن لائن کورس اپنائے ہیں۔یہ تبدیلی درس وتدریس کی موجودہ طرزِ عمل کی تنظیمِ نو کے لیے ایک اہم موقع ہو سکتی ہے۔

(i)۔آن لائن لرننگ ایک نیا تجربہ

لاک ڈاؤن کے دن سے ملک بھر کے طلباء آن لائن تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔میڈیکل انجینئرنگ اسٹریم کے تقریباً ۲۵.۱ لاکھ طلباء باقاعدہ آن لائن کلاسیں لے رہے ہیں۔اسکولوں اور کالجوں نے بھی تعلیم کا رخ کیا ہے۔کلاس ڈھانچے کا آن لائن ہائبرڈ ماڈل تعلیم میں تسلسل کے لیے ہماری ترجیح رہی ہے۔ہم نے ہمیشہ طلباء کو ہمہ گیری سیکھنے کا تجربہ فراہم کرنے کی جانب کام کیا۔

(ii)۔ورچوئل کلاس روم

ہمارے تجربے کار اساتذہ میں آن لائن کلاسیز لیتے ہیں۔درس کا تجربہ کلاس روم، کلاس روم تدریس ماڈل سے بہتر ہے۔ہائبرڈ ماڈل یا تدریس کا طریقہ، کلاس روم کے مواد، طریقہ کار اور تدریسی طریقوں کی نگرانی اور ہر طالبِ علم کی توجہ کے قابل بناتا ہے۔اس سے طلباء کا وقت، رقم اور توانائی کی بچت ہوتی ہے۔

(iii)۔آن لائن تعلیم کے اسباب

انٹرایکٹیویٹی آن لائن کا کلیدی لفظ ہے۔آن لائن موڈ میں سیکھنے کے اوزار شامل ہیں۔ جیسے مفروضوں کی اوڈیو ویجوئل وضاحت، حل شدہ مثالوں، انٹرایکٹو نقلیات، مشق کے لیے سوالات، اپنی مرضی کے مطابق جائزے جو انتہائی مفید ہیں۔آن لائن کلاسیز کے ذریعے طلباء کی صلاحیتوں کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔طلباء کی رپورٹس والدین کو یہ جاننے میں مدد دیتی ہے کہ بچوں کی سمت کس سمت میں ہے۔

(Dainik Bhasker 28-07-2020 Page No.8)

عام زندگی پر لاک ڈاؤن کے اثرات

جس دن وزیرِ اعظم نے ''جنتا کرفیو'' کا اعلان کیا تھا۔میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجی، وزیرِ اعظم کا خطبہ ختم ہونے سے پہلے دس دس کلو آٹے اور چاول کے پیکٹ آن لائن منگوا لیے گئے۔لیکن جیسے ہی میں دالوں کا آرڈر دینے کے لیے گئی میرے اعتماد کے پر کھچے اڑ گئے۔ارہر اور مسور کے سامنے ''اسٹاک'' ختم لکھا ہوا تھا۔چپس، دو قسم کے بسکٹ اور واشنگ پاوڈر کے خانوں میں بھی کچھ ایسا ہی دیکھنے میں آیا۔

پچھلے کئی سالوں میں یہ پہلا موقع تھا۔یقیناً تمام لوگ آگے آنے والے وقت کو مجھ سے پہلے بھانپ چکے تھے۔چلیے ابھی تو ایک ہی روز کا (۱۴ گھنٹے) جنتا کرفیو ہے خود کو دلاسا دیا اور اگلے دن اناج بھی خرید کر رکھ دیا۔

جنتا کرفیو پورا ہوا اور اگلے روز یعنی ۲۳ مارچ کورونا وائرس کے بڑھتے قدموں کو ٹوٹنے میں بنتا۔ اگلی شام کو وزیرِ اعظم نے ۲۱ دن کے لاک ڈاؤن کا اعلان کر دیا۔ گھر پر ہی تھے تو فوراً سبزی وغیرہ لاکر فرج میں رکھنے کی قوائد میں لگ گئے۔

سبھی اے.ٹی.ایم مشینوں کے آگے لمبی قطاریں دیکھنے کو ملی۔ ظاہر ہے لوگوں کے ذہن میں نوٹ بندی کے شروعاتی دنوں کی یادیں ابھی تازہ ہیں۔ پینک بائنگ یا سامان ختم ہونے کے خوف سے ڈھیر سارا اور فوراً خرید فروخت والا منظر دیکھا۔ اسکول کے دنوں میں اگر کبھی کرفیو لگتا تھا تب دو چار روز یہی عالم رہتا تھا۔

لاک ڈاؤن کی شروعات ہوئی۔ درین اثنا مرکزی حکومت، ریاستی حکومت اور ضلعی انتظامیہ کی طرف سے مسلسل پیغامات موصول ہونے لگے کہ اناج، سبزیوں، دودھ، روٹی کی فراہمی میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ دوسری طرف سبزیوں کی قیمت کم ہونے کی بجائے بڑھ گئی۔ چکن، گوشت اور مچھلی کے شوقین زیادہ پریشان نظر آئے یا تو ان کو اپنا مطلوبہ سامان نہیں مل رہا تھا یا کہ بہت مہنگا پڑ رہا تھا۔

جب لاک ڈاؤن کی ابتدا ہوئی تھی تب ۱۳۰ انڈوں کی ایک ٹرے ۱۳۰ کی مل رہی تھی اور اب یہ ۲۱۰ میں خریدی گئی۔ کیا معلوم انڈے بھی ایک ہی مرغی کے رہے ہوں۔

راشن کی دوکان میں اوّل تو سبھی سامان مل نہیں رہے تھے اور جو مل رہے تھے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ہم نے خرید لیے تھے۔ بریڈ، دودھ، دہی تو روز ہی آتا تھا۔ اور اب دگنا آ رہا تھا۔ کیوں کہ ڈر تھا کہ بازار میں ختم نہ ہو جائے۔ دوکان میں چپس اور بسکٹ والی الماری بھری دیکھ کر دل کو ویسی ہی تسلّی ہوئی تھی جیسے بلڈ پریشر (B.P) ناپنے والی مشین میں ۱۲۰/۸۰ کی ریڈنگ دیکھ کر ہوتی ہے۔ یہاں بھی ضرورت سے زیادہ خرید لیا۔

دوائیں تو سمجھئے ایک نہیں اگلے دو مہینوں کی خرید لی تھی۔ اگر دوکان والے نے دینے سے انکار نہ کیا ہوتا تو شاید تین مہینوں کی خرید لیتے۔ لوک ڈاؤن بڑھنے سے وابستہ الجھنوں میں

آہستہ آہستہ آٹا، چاول بھی اتنا خرید لیا کہ اب ڈر تھا کہ ہم سے پہلے کہیں چوہے یا گھن نہ کھالیں۔ بظاہر ہے کہ ملک گیر لاک ڈاؤن کی جائز وجہ کورونا وائرس کے بڑھتے ہوئے پھیلاؤ سے بچنا ہے۔ اور لاک ڈااؤن کو ابھی دو ہفتے ہی ہوئے تھے اور سوچنے والی بات یہ تھی کہ جہاں سے کورونا شروع ہوا تھا وہاں کا لاک ڈاؤن ۱۱ ہفتے بعد ہٹا۔

لیکن ہمارے یہاں پچھلے ایک مہینے کے دوران اناج کے علاوہ سبزیوں کے دام غالباً دگنا بڑھ گئے تھے۔ سبزیوں کے علاوہ تمام صارفین کی اشیا جیسے بسکٹ، نمکین وغیرہ بھی آہستہ آہستہ دوکانوں میں کم لیکن مہنگے دکھے۔ کیوں کہ ان کی پیداوار فی الحال تعطل کا شکار تھی۔ بظاہر صارفین کو جو بھی چیز تھوڑی زیادہ دکھتی وہ مشکل حالات میں اسے جمع کر لیتا ہے۔

اگر چہ چند ماہرین کے مطابق لاک ڈاؤن کے اس مرحلے میں صرف گھریلو اخراجات میں اضافہ ہوا۔ دوسرے اخراجات میں کمی آئی تھی۔ مثال کے طور پر گھر پر ہی رہنا پڑ رہا تھا۔ تو گاڑیوں میں پیٹرول یا ڈیزل نہیں ڈلوانا پڑتا تھا لاک ڈاؤن کے دوران خرید فروخت، باہر کھانے یا سنیما دیکھنے، پبلک ٹرانسپورٹ یا کام پر جانے کے اخراجات مکمل طور پر بند تھے۔ پابندی کے سبب نہ تو لوگ سفر کر رہے تھے اور نہ ہی چھٹیوں میں گھومنے جا رہے تھے۔

کورونا وائرس کے اثرات کو روکنے کے لیے ملک بھر میں لاک ڈاؤن نافذ کیا گیا۔ لیکن اس کا براہِ راست اثر ہندوستان کے غریبوں اور مزدوروں پر پڑا۔ ماضی میں جس طرح سے ملک بھر میں مزدور نقل مکانی کرتے دیکھے گئے وہ اس ملک کی زمینی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے۔

لاک ڈاؤن کی وجہ سے مزدور طبقہ بھوکا اور پیدل اپنے گھر کی اور روانہ ہو گیا۔ جس کا خمیازہ کئی مزدوروں کو اپنی جان دیکر چکانا پڑا۔ کئی دنوں تک لگاتار بھوکے پیاسے پیدل چلنے سے کئی مزدوروں کی موت ہو گئی۔ انہیں سب کے بیچ غیر سرکاری تنظیم نے شمالی اور درمیانی ہندوستان کے درمیان ٹیلی فونک سروے (Tele phonic Sarve) سے چند مندرجہ ذیل ضروری نتائج نکالے ہیں۔

اس سروے کے مطابق لاک ڈاؤن کا تارکین وطن مزدوروں کی روزی روٹی پر گہرا اثر پڑا۔مزدوروں پر کیے گئے سروے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لاک ڈاؤن کے چلتے ۹۲.۵ فیصد مزدور ایک سے تین ہفتے کے درمیان اپنا کام کھو چکے تھے۔

وہیں اس سروے کے مطابق ۴۲ فیصد مزدوروں نے بتایا کہ ان کے پاس اگلے دنوں کے لیے راشن نہیں ہے۔جب لاک ڈاؤن کو آگے بڑھایا گیا تو ۶۶ فیصد مزدوروں کے پاس راشن ختم ہو چکا تھا۔اس کے بعد ان کے پاس اپنا گھر چلانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

یہ سروے بتاتا ہے کہ ایک تہائی مزدور لاک ڈاؤن کے چلتے ابھی بھی شہروں میں پھنسے تھے۔ جہاں انہیں کھانے پینے اور پیسوں کی بھاری کمی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔وہیں قریب آدھے تارکین وطن مزدور پہلے ہی گاؤں جا چکے تھے جہاں وہ راشن کی کمی کا سامنا کر رہے تھے۔

اس سروے کے مطابق ۳۱ فیصد مزدور قرض سے دبے ہوئے ہیں جسے وہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔لیکن ان کے پاس روزگار نہیں ہے۔ یہ وہ قرض ہے جو انہوں نے لوگوں سے ادھار لیے تھے۔اور یہ قرض بینکوں سے لیے گئے قرض سے تین گنا زیادہ تھا۔ان میں سے ۷۹ فیصد سے زیادہ قرض دار وہ مزدور تھے جو وقت پر قرض ادا نہیں کر سکتے تھے۔نیز یہاں ایک افسوس ناک امر یہ کہ ان مزدوروں میں سے ۵۰ فیصد ایسے تھے کہ جن پر قرض ادا نہ کرنے پر جان لیوا حملہ ہونے کے آثار تھے۔

وہیں اس سروے میں شامل ۲۶۵۵ مزدوروں کا کہنا تھا کہ ان کے پاس روزگار نہیں کیوں کہ روزگار رہے ہی نہیں۔وہیں ۱۵۲۷ مزدوروں نے بتایا کہ وہ اپنے گاؤں لوٹنے کی حالت میں نہیں تھے۔جبکہ ۲۵۸۲ مزدوروں کے گھروں میں راشن ختم ہو چکا تھا۔ان میں سے ۷۸ لوگ ایسے تھے جو بچّوں کی تعلیم کے اخراجات نہیں اٹھا سکتے تھے۔وہیں ۴۸۳ لوگ بیماری کے شکار ہیں۔جبکہ اس درمیان صرف ۱۱ لوگوں نے مانا کہ انہیں لاک ڈاؤن میں کسی طرح کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہے۔

اس سروے میں یہ بھی انکشاف ہوا کہ ۵۵ فیصد مزدوروں نے قریب چار افراد کے خاندان کو چلایا تھا۔ اپنے خاندان کے لیے ان مزدوروں نے ہر روز ۲۰۰، ۴۰۰ روپے کماتے ہیں۔ جبکہ ۳۹ فیصد مزدوروں نے ۴۰۰، ۶۰۰ روپے کمائے ہیں۔ یعنی ان مزدوروں میں سے زیادہ تر نے کم سے کم اجرت ایکٹ دائرے سے بھی نیچے کمائی کی ہے۔

(Panjab Kesri 06-04-2020)

کورونا وائرس، لاک ڈاؤن پر طنز و مزاح اور شاعری

طنز:

صرف کہنے کے لیے لاک ڈاؤن میں کوئی سڑک پر نہیں آیا۔ لیکن حقیقت میں گھر بیٹھے بیٹھے کئی لوگ سڑک پر آ گئے۔

مزاح:

غضب کے دن آئے ہیں۔ سوسائٹی میں رہنے والے ڈاکٹر کا ٹیمپریچر سوسائٹی کا واچ مین لیتا ہے اور کہتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب آپ ٹھیک ہیں اندر جا سکتے ہیں۔ وقت سب کا آتا ہے۔

شاعری (نظم):

یہ لاک ڈاؤن کا اثر ہے

دروازے پر دستک نہیں کوئی
اب نہ چوری کا ڈر ہے
گھر گھر میں چھائی ہے رونق
یہ لاک ڈاؤن کا اثر ہے

خالی ہو گئی شہر کی سڑکیں
ان سے نہیں گزرتا کوئی
میلوں تک تنہائی پھیلی
دکھتی گند نہ اب کوئی

چائے، پکوڑی پزّا برگر
مول کے سیر سپاٹے
غائب ہوئے جنک فوڈ سب
گھر کا کھانا کھاتے

گھر میں رہ کر خود ہی کریں سب
صاف صفائی برتن
سب کا ہاتھ لگا جب مل کر
چمک اٹھے گھر آنگن

پیٹ ہوا اندر اب سب کا
جم کر کام ہوا اب گھر کا
برسوں سے فرست نہیں تھی جن کو
وہ کام کرے اپنے من کا

اتنی خوش قدرت ہے دکھتی
اتنا شانت ہوا انساں
دھرتی سے امبر تک دیکھو
کتنا خوش نما ہے سماں

جتنا چاہیں ٹی۔وی دیکھیں
یوگ کریں یا فون کریں
اپنے سارے بچھڑے رشتوں کو
پھر سے یاد کر ٹون کریں

ایک عجیب سا سکوں ملا ہے
یوں تو دل ڈرتا ہے
گھر کے اندر ہی محفوظ
باہر کورونا پھرتا ہے

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ دینک بھاسکر رس رنگ،(۲ اگست ۲۰۲۰)
۲۔ دینک بھاسکر،(۹ اگست ۲۰۲۰) صفحہ نمبر ۱۳
۳۔ ماخذ: اطالوی وزراتِ صحت،
۴۔ ایشیہ نیٹ نیوز، نئی دہلی (۵ جون ۲۰۲۰)
۵۔ پتریکا نیوز،(۲۳ مئی ۲۰۲۰)
۶۔ نیوز ۱۸.،(۲۳ جون ۲۰۲۰) گوگل
۷۔ دینک بھاسکر،(۲۸ جلائی ۲۰۲۰) صفحہ نمبر ۸
۸۔ پنجاب قیصری،(۶ اپریل ۲۰۲۰)

پس نوآبادیاتی تنقید اور فرانز فینن

محمد امان اللہ خان
ریسرچ اسکالر، پی ایچ ڈی اردو،
وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون سائنس و ٹیکنالوجی
اسلام آباد، پاکستان
khan.maliklalian@gmail.com

Post- Colonial Theory , Criticism and Frantz Fenon

Abstract:

Colonialism is strictly referred to the policies and Methods by an Imperial Power maintained and extended its control over the territories or People. A policy of extending a Country's Power and influence through diplomacy or military. It also affects the literature of the Subject Country which is controlled by the colonialist. The Policy or practice of acquiring full or partial Political control over another country, occupying it with settlers and exploiting it economically. Frantz

Fanon has discussed much about the relationship between Colonial system and the people who have been the victim of this rude system of rul upon the innocent people . He has passed much time to examine the rule of British Government and feel much trouble of thinking due to Colonial system upon the people of Africa, Hindustan. His Books: Black Skin and white Masks, A dying Colonialism and the wretched of the Earth are most important to understand the theory of Post Colonialism and its impacts on people of Africa and Asia. One of his books is translated in Urdu with name of افتادگانِ خاک By Sajad Baqar Rizvi in Pakistan. He Clearly gives the showing glance of Colonial System and Colonialized Areas and People of Colony. This Article presents a brief history of Post - Colonial Studies of Frantz Fenon and theory of post - Colonial and its impacts on criticism especially in Urdu and other languages of oriential people, we can study and see in all over the world about the impact of this theory.This Article also Present an analysis of Colonial system and its impact on Urdu Criticism.

Key Words:

Edword Said, Frantz Fenon, Orientalism, Behaviour,

Covsumer's Values, Exploitative

ایڈورڈسعید، فرانزفینن، شرق شناشی، صارفی اقدار، استحصالی رویے

جب کوئی ریاست اپنی طاقت کے بل بوتے پر کسی کم زور ریاست کے علاقے اور لوگوں کو اپنی عمل داری میں لے کر مقبوضہ ریاست کے قدرتی وسائل اور وہاں کے افرادی قوت کو اپنے اقتصادی اور معاشرتی ترقی کے فروغ کے لیے استعمال کرے تو مغلوب ریاست غالب ریاست کی نوآبادی کہلاتی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نوآبادیاتی نظام ایک ایسا نظام ہے جس میں طاقت ور ریاست اور قوم کسی کم زور ریاست اور قوم کو اپنے مفاد کی خاطر اپنے قبضے میں لے لیتی ہے۔ قابض ریاست کا غلبہ مقبوضہ ریاست کے تمام تر قدرتی، معاشی، معاشرتی اور اقتصادی وسائل کے ساتھ ساتھ افرادی قوت اور تجارتی منڈیوں پر بھی ہوتا ہے۔ اسی غلبہ کی بنا پر قابض ریاست اپنی اقتصادی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی ترقی کو فروغ دیتی ہے۔ نہ صرف اقتصادی و معاشرتی شعبے بل کہ حکومتی انتظام چلانے والے تمام ادارے بھی قابض ریاست کے دائرہ اختیار میں آ جاتے ہیں۔ یوں قابض ریاست اپنی اس نوآبادی پر مکمل اختیار حاصل کر لیتی ہے۔ مزید یہ کہ اس اختیار کو برقرار رکھنے کے لیے فوجی طاقت کا بھی بھرپور استعمال کیا جاتا ہے۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ قابض ریاست اپنی نوآبادی کے مقابلے میں معاشی، معاشرتی، اقتصادی مجموعی اعتبار سے کہیں آگے ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حربی اور سائنسی حوالے سے بھی فوقیت رکھتی ہے۔ قابض ریاست اپنی اسی برتری کی بنا پر خود کو مقبوضہ قوم کے مقابلے میں ایک بہتر قوم اور نسل شمار کرتی ہے اور یہی احساسِ تفاخر ہی غالب قوم کے عزائم کو مزید تقویت دینے کے ساتھ مہمیز بھی دیتا ہے اور وہ دوسری اقوام کو اپنے زیرِ نگیں کرنے اور ان کے وسائل سے فائدہ اٹھانے کو اپنا حق سمجھنے کا احساس پیدا کرتا ہے۔

نوآبادیاتی نظام ایک اصطلاح ہے جو یورپی اقوام کی دیگر کم زور اقوام پر سیاسی گرفت

اوران کے وسائل پر قابض ہونے کے طریقہ کار کے لیے مستعمل ہے۔ یورپی نوآبادیاتی نظام نے باقاعدہ طور پر سولہویں صدی عیسوی میں اپنا وجود قائم کرنا شروع کیا اور اٹھارویں صدی عیسوی تک اس استعماری نظام نے تشکیل پا کر اپنی جڑیں مضبوط کیں، جب کہ انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں برطانوی قوم نے دنیا کی مختلف کم زور اقوام کو اپنے تسلط میں لے کر نہ صرف اپنی نوآبادیاں بنایا بلکہ ایک مربوط اور منظّم نوآبادیاتی نظام کی بنیاد رکھ کر دنیا کے تقریباً پچیس فی صد حصہ کو اپنے زیر نگیں کرلیا۔

ڈاکٹر مبارک علی اپنے مضمون "امپیریئیل ازم کیا ہے" میں اس کو کچھ ان الفاظ میں ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”صنعتی انقلاب کے ساتھ ہی اس نظام کے حوصلے مزید بلند ہوئیاوراس کی قوت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔تجارتی مسابقت اورنئی منڈیوں کی تلاش برطانیہ، ہالینڈ، پرتگال اوراسپین کو امریکہ، ایشیا،افریقہ، اورآسٹریلیا کے بیشتر حصوں میں لے گئی جہاں ان قابض مما لک نے اپنی اپنی نوآبادیات قائم کیں۔ انیسویں صدی میں روس، اٹلی، جرمنی اور خود امریکہ بھی ان استعماری مما لک کی صف میں شامل ہوئے“۔(۱)

اردوانگلش ڈکشنری کے مطابق لفظ Colonialism کے مفاہیم کچھ یوں ہیں:

> "The Policy or practice of aquiring full or partia political control over another country, occupying it with swttlwrs and exploting it economically." (2)

ترجمہ: کسی بھی ملک پر کسی دوسرے طاقتور ملک کا سیاسی طرز کا کنٹرول (چاہے وہ جزوی ہو یا مکمل) نوآبادیاتی نظام کہلاتا ہے جو کہ آبادکار کو معاشی واقتصادی فائدہ دیتا ہے، اگر چہ اس مقبوضہ ریاست

کا استحصال ہی کیوں نہ ہو۔

اسی طرح جب لفظ سامراج یا امپریئیل ازم کو دیکھا گیا تو اس کے مفاہیم کی فہرست میں ذیل کا مفہوم پایا گیا:

"A policy of extending a country's power and Influence through diplomacy or military."(3)

ترجمہ: کسی ملک کا فوجی طاقت یا سفارت کاری کے بل بوتے پر کسی دوسرے ملک پر حکومت کرنا سامراج یا شہنشاہیت کہلاتا ہے۔

واضح رہے کہ اس عمل میں اپنی طاقت کا لوہا منوانے کے لیےفوجی طاقت کے استعمال کو ہمیشہ فروغ دیا جاتا رہا ہے۔عالمی جنگیں اس بات کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔

فیروز اللغات کے مطابق سامراج **''نوآبادیات اور ماتحت سلطنتیں رکھنے کی پالیسی"** (۴) ہے۔اسی طرح نوآبادی **"نیا آباد کیا ہوا علاقہ، کالونی، مقبوضہ علاقہ''** (۵) ہے۔نوآبادیات کا لفظ نوآبادی کا اسم جمع ہے جس کے لغوی معنی نئی آبادی یا نئی کالونی۔کالونی کا لفظ بنیادی طور پر لاطینی اصطلاح Colonia سے نکلا ہے جس کے مفہوم میں کچھ منظّم افراد کا کسی دوسری انسانی آبادی کو یرغمال بنا کر اس کے استحصال کے لیے اپنی نئی آبادیاں قائم کرنا شامل ہے۔اسی وجہ سے یہ لفظ ایک خاص سماجی حالت کا ترجمان ہے۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر اس لفظ کی معنوی حدود کا تعین کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں **''یہ انسانوں کے مخصوص گروہ کے ہاتھوں برپا ہونے والی صورتِ حال ہے''** (۶) یہ صورتِ حال پیدا کرنے والے افراد نوآبادکار کہلاتے ہیں۔ڈکشنری آف پالیٹکس کے مطابق نوآبادیات (Colonialism) کی تعریف کچھ ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"Colonialism: Stricty referred to the politics and methods by an imperial power

maintained and extended its control over other terrotories or people, Now more frequently used in a pejorative sense. Often synonymous with imperialism." (7)

فرہنگ اصطلاحات میں اس کے معانی **"استعمار پسندی اور استعماریت"** (۸) بیان ہوئے ہیں۔تاریخ بتاتی ہے کہ نوآبادیات کی اصطلاح کا استعمال سب سے پہلے روم کے لوگوں نے کیا۔وہ جب بھی کسی علاقے کو فتح کرتے تو اس پر اپنا قبضہ برقرار رکھنے کے لیے مفتوحہ علاقوں میں اپنی قوم کے افراد پر مشتمل گروہ وہاں بسا دیتے تھے۔اس جدید دور میں یہ اصطلاح غیر ملکی تسلط اور قبضے کے لیے مستعمل ہے۔یورپی اقوام نے جب امریکہ،ایشیا،افریقہ،آسٹریلیا،نیوزی لینڈ وغیرہ پر اپنا قبضہ پکا کرلیا تو یورپی اقوام نے رومی لوگوں کی طرح اپنی اقوام کو یہاں نہیں بسایا بلکہ مقامی آبادی کے چند افراد کی مدد سے انتظام وانصرام قائم رکھا۔اس کی واضح مثال ہندوستان میں دیکھی جاسکتی ہے جہاں پر صرف چالیس (۴۰) ہزار یورپی افراد نے مقامی افراد پر مشتمل دو لاکھ افراد کی فوج بنا کر بیس (۲۰) کڑور افراد کو اپنا غلام بنائے رکھا۔نوآبادیاتی تصور کو دو بنیادوں پر پیش کیا گیا۔وہ دونوں تصورات یہ تھے:

۱۔ ہم بہتر قوم ہیں لہٰذا خدا ہمارے ساتھ ہے۔

۲۔ ہم مہذب اور ترقی یافتہ ہیں اس لیے غلاموں کی اصلاح ہمارا فرض ہے۔ (۹)

جیسا کہ Kipling نے اپنی مشہور نظم White Man's Burden میں بھی اس کا واضح اظہار کرتا ہے۔

پس نوآبادیاتی مطالعہ میں جن سیاسی وسماجی،ثقافتی،معاشی،معاشرتی،علمی وادبی مباحث کو مرکزی دھارے میں لایا گیا ان میں عالم گیر حربے،صارفی اقدار،اقوام کی ذلت،نسوانی طبقات اور سامراجی طرز حکومت کے سبب نوآبادیاتی ثقافتوں میں پیدا ابھرنے والے تغیر وتبدل،

اس کی نشو ونما اور ارتقاء کے مخصوص زاویوں کو خصوصی اہمیت دی جاتی رہی ہے۔ اس قسم کے مطالعہ کی نظریاتی بنیادوں پر مشرق و مغرب کے چند اہم دانش وروں نے قلم اٹھایا ہے۔ اس ضمن میں ایڈورڈ سعید (۱۹۳۶ء-۲۰۰۳ء) کی کتاب "شرق شناسی" (Orientalism) اہم ترین کاوش ہے۔ اس کتاب میں ایڈورڈ سعید نے اسلامی دنیا کے بارے مغربی طرز فکر کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ خاص طور پر مظلومین کے حق میں انتہائی مضبوط دلائل سے بات کی ہے مغربی اقوام کی مشرقی اقوام پر بالا دستی، مزاحمت کاری، عمل داری، مغربی اقوام کی نسل پرستی، بیانیے اور بطور خاص مشرقی اقوام کی تاریخ مسخ کرنے جیسی پالیسیوں پر اپنے علمی بساط کے مطابق خوب بحث کی ہے۔ ایڈورڈ سعید نے اپنی کئی دیگر کتب میں پس نوآبادیاتی بیانیے کی وضاحت کی ہے اس کی اہم ترین کتب ہیں۔

1. The Question of Palestine
2. Covering Islam
3. After the last sky
4. Blaming the victims
5. Culture and Imperialism
6. Literature and Society
7. The Pen and the Sword
8. The world the text the critic

After the اور the Question of Palestine ،Covering Islam Last sky ان تینوں کتب میں عرب دنیا خاص فلسطینی عوام کے مسائل کو بحث کا موضوع بنایا ہے۔ ایڈورڈ سعید کے فکری نظام میں جن دیگر شخصیت کا عکس ملتا ہے اس میں جوزف کونارڈ کی فکر واضح نظر آتی ہے جوزف کونارڈ خود بھی مغربی سامراجیت کا انتہائی مخالف تھا۔ ایڈورڈ سعید عربی، فارسی اور انگریزی ادبیات پر مہارت نامہ رکھتا تھا۔ اسی لیے انھوں نے ان زبانوں کے علمی اور ادبی

مباحثوں اور ذخیروں کا بہ خوبی جائزہ لیا اور ان میں درآنے والے استعماری و استحصالی رویوں پر کھل کر تنقید کی ہے۔ انگریزی زبان و ادب پر کڑی تنقید کرتے ہوئے معروف ناول نگار Jane Auston کے ناول Pride and Prejudice کو اپنے نشانے پر لیا۔ اسی طرح ردیاڈ کپلنگ کے نام "Kim" کے ساتھ دیگر افسانوی تحریروں کو بھی سامراجی استعمار کی کڑیاں قرار دیا۔ تہذیب و تمدن کی بنیادی قدروں اور ان قدروں پر سامراجی اثرات کے جائزہ کے لیے ایڈورڈ سعید نے اپنی کتاب "ثقافت اور سامراج" Culture and Imperialism لکھ ڈالی۔ اس کتاب میں مختلف زبانوں کے ادبی متون کو بطور سند کے پیش کیا ہے۔ ایڈورڈ سعید کی ناقدانہ رائے میں سیاسی فکر و فلسفے، معاصر حالات اور واقعات کے ساتھ ساتھ تہذیب کے سماجی و ثقافتی رویوں پر روشنی ڈالی گئی ہے ایڈورڈ سعید کے ان تجزیات کو گزشتہ دو سے اڑھائی سو سال کے سامراجی و استعماری نظاموں کے حوالہ سے لاجواب سمجھا جاتا ہے۔ ان کے مطابق نوآبادیات کے مقتدر طاقتیں اپنی محکوم آبادیوں کو بے بس، لاچار اور کم زور بنانے کے لیے ان کی معاشرتی، ثقافتی، تاریخی، لسانی علمی، عملی، سماجی اور سیاسی قدروں سے اچھی طرح واقفیت حاصل کرتی ہیں اور یہی واقفیت ان کے لیے طاقت کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔ معروف و مشہور فلسفی اور مفکر نطشے کا نظریہ علم "Knowledge is Power" کو نوآبادکاروں کے نوآبادیاتی نظام کا لازمی حصہ سمجھا گیا ہے۔ ایڈورڈ سعید نے اس فلسفے کے انقلاب پرور تصور کو ''Knowledge is colonialism'' میں استعمال کر کے استعماری و سامراجی نظام کے استحصالی رویوں اور حکمت عملیوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ ان کے خیال میں نوآبادیاتی نظام ایک مدغم دنیا ہے جس میں دنیا کے مختلف علاقوں کے ثقافتی و سیاسی، سماجی و معاشی، معاشرتی اقتصادی قدریں اور رویے باہم مل کر نئے نئے معاشرتی رویے تخلیق کر رہی ہیں اور یہ سلسلہ آہستہ آہستہ باقاعدہ ایک عالم گیر نظام کی طرف جاتا محسوس ہو رہا ہے اس عالم گیر سلسلہ کو قائم کرنے کے لیے کئی قوتیں متحرک ہو کر اجتماعیت کا سامان کر رہی ہیں:

'عالم گیریت کا تصور سب سے پہلے میکلوہن (Maclauhan)نے ۱۹۶۸ء میں The Global Village کی اصطلاح استعمال کر کے علمی دنیا میں متعارف کرایا"۔(۱۰)

ایڈورڈ سعید یورپی سامراجیت کے دور پر بحث کرتے ہوئے اپنے مؤقف میں بیان کرتے ہیں کہ یورپی مغربی استعمار اور سامراجیت کی شروعات انیسویں صدی کے صنفی عہد سے ہوتیں ہیں۔اس کے مرکزی کردار فرانس اور برطانیہ تھے۔ان قوتوں نے اپنے مقتدر بیانیے کے زور پر اپنے سے کم تر اور کم زور اقوام پر غلبہ حاصل کر کے ان کے زمینی، زرعی، معاشی، اقتصادی وسائل پر قبضہ کیا اور ان وسائل سے حاصل ہونے والے خام مال کے ساتھ ساتھ افرادی قوت بھی حاصل کی اور اپنی معاشی بنیادوں کو مضبوط تر بنایا۔محکوم طبقہ علمی سر پرستی اور تہذیبی ترقی کے نام پر بھی ان سامراجی اور استعماری طاقتوں کے سبب استحصال کا شکار ہوا۔اس استحصال نے دیگر معاصر تاریخی بیانیے کی معروضیت کو بے دردی سے پامال کیا اور اس کو مسخ کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی بیسویں صدی میں طاقت کے نشے سے بھرپور ان سامراجی طاقتوں نے پوری دنیا کو اپنے ماتحت کرنے کے خواب دیکھے اور ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے طاقت کا اندھا دھند استعمال کیا نتیجہ یہ نکلا کہ عالم گیر جنگوں کے سبب سامراجی اور یہ استعماری نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا اور بیسویں صدی کے آخری ربع تک تمام نو آبادیاتی آبادیاں اور محکوم اقوام آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ البتہ سرد جنگ میں مشترکہ طاقتوں کے ناکام ہونے پر تیسری دنیا ایک نئی قسم کی نوآبادیاتی صورت حال سے دوچار ہوگئی ہے۔اسی نئی نوآبادیاتی دنیا اور نئے نظام میں امریکہ کو یک قطبی قیادت بن کر ابھرا۔موجودہ دور میں نئے نوآبادیاتی، سامراجی اور استعماری نظام کے استحصالی اثرات پہلے نوآبادیاتی نظام سے کہیں زیادہ خطرناک اور تشویش ناک صورت حال اختیار کر چکے ہیں جس کی زندہ مثال افغانستان،عراق، شام،فلسطین، کشمیر،یمن اور برما جیسے

علاقوں میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

ایڈورڈ سعید نے فلسطینی عوام کے کرب کو محسوس کرتے ہوئے حق گوئی کا ساتھ دیا اور اپنے ہی ملک کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ 1980ء میں شائع ہونے والی ان کی کتاب "Covering Islam" میں انہوں نے مسلمانوں کی مظلومیت کا مقدمہ بڑی جرأت مندی سے لڑا ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں مغربی مفکرین، فلاسفروں اور دانش وروں کی طرف سے اسلام کی مسخ کر کے پیش کرنے پر سخت تنقید کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکی حکومت کی طرف سے شروع کیے گئے نئے نو آبادیاتی، سامراجی اور استعماری ایجنڈے کا پردہ چاک کرتے ہوئے اس کی استحصالی کارروائیوں کو وضاحت سے پیش کیا ہے۔ مزید براں یہ کہ اسی فکری و تنقیدی تناظر میں ۹/۱۱ کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹا گون پر حملوں کو بھی امریکہ اور اسرائیل کی ذاتی منصوبہ بندی اور استعماری کارروائیوں کا شاخسانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

پس نو آبادیات مطالعہ دنیا کے اکثر علاقوں میں واقع ہونے والی نو آبادیاتی صورت حال اور اس سے قائم ہونے والے سماجی، سیاسی، ثقافتی، علمی و ادبی رشتوں کو واضح کرتا ہے یہ رشتے عموماً نو آبادکار قوتوں اور ان کی محکومین کے مابین قابض اور مقبوض ہونے کے ناطے کو واضح کرتے ہیں۔ نو آبادکار اور نو آبادی کے باشندوں کے مابین مزاحمت اور مفاہمت کی اکثر صورت ان مخصوص مفادات کا نتیجہ ہوتی ہیں جن کے سبب نو آبادکار ان مقامی آبادیوں پر اپنا قبضہ جمائے ہوئے ہوتا ہے۔ نو آبادکار اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے ایسے بیانیے تشکیل دیتا ہے جو ان کے ان آبادیوں پر کنٹرول اور قیام کا جواز فراہم کرتے ہیں یہی بیانیہ اکثر و بیشتر ایک خوف کی طرح مقامی آبادیوں کی نفسیات پر اثر انداز ہوتے ہیں جن کے اثرات سے باہر آنے کے لیے مقامی باشندوں کو صدیوں پر محیط سفر طے کرنا پڑتا ہے اور اس سارے سفر میں نسلوں کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ پس نو آبادیاتی مطالعہ، نو آبادیاتی دور میں تشکیل پانے والے ایسے ہی بیانوں کو دنیا کے سامنے لانے کی کاوش ہوتی ہے۔ سیاسی، علمی و ادبی، سماجی، معاشرتی، اقتصادی، معاشی، ثقافتی، سائنسی سطح پر

سرایت کر جانے والی بہت ساری تبدیلیاں، جن کا اکثر نوآبادکار مقامی باشندوں کے لیے انقلاب کی راہ قرار دے چکا ہوتا ہے اور ان کے ترقی کے سہانے خواب دکھا چکا ہوتا ہے۔ دراصل اپنی طاقت اور اقتدار کو مضبوط کرنے اور برقرار رکھنے کا ایک ذریعہ ہوتی ہیں اردو زبان وادب میں پس نوآبادیاتی مطالعہ کے آغاز کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اس حوالہ سے جو تحریریں منظر عام پر آئیں ہیں ان میں ایڈورڈ سعید کی کتب شرق شناسی، ثقافت اور سامراج، Covering Islam کو اساس قرار دیا جا سکتا ہے۔

فرانز فینن پس نوآبادیاتی مطالعہ کے پہلے پہلے مفکرین میں شمار ہوتے ہیں جو فکری نظریات وتصورات انھوں نے پیش کیے ہیں اردو ادب ان پر کم توجہ کی گئی ہے۔ برصغیر پاک و ہند پر انگریز سامراج کے دور میں تخلیق ہونے والے ادبی متون کو فینن کے نظریاتی تناظر میں انگریزی نوآبادیاتی نظام کو باآسانی دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ طاقت کے وہ سیاسی، سماجی اور ثقافتی مظاہر کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی متون جن کے ذریعے ان نوآبادکاروں نے صوبوں میں رائج نظام حکومت، رسوم اور رواج، اقدار اور روایات اور زبان وادب کو اچھی طرح پرکھا جا سکتا ہے، فرانز فینن نے نوآبادیاتی دور کی صورت حال کے زمرے میں جن حقائق سے پردہ اٹھایا ہے ان میں خاص اقتصادی اور معاشی صورت حال کو معاشی و اقتصادی سطح پر کم زور قوموں اور طاقت ور اور زور آور قوموں کے مابین موجود باہمی کش مکش سے ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ تمام اقوام و ممالک جو کبھی کسی نہ کسی صورت میں نوآبادیاتی، سامراجی یا استعمارات کا حصہ رہے ہیں، آج بھی نفسیاتی، معاشی، اقتصادی طور پر مکمل آزادانہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نوآبادیاتی دور کے قائم کردہ بیانیے نے اپنے اثرات اتنے پختہ انداز میں ثبت کیے ہیں کہ آج بھی نوآبادیاتی دور کی محکوم اقوام بالواسطہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑی محسوس ہوتی ہیں۔ اس حوالے سے برصغیر پاک و ہند میں نوآبادیاتی غلامی سے آزادی حاصل کرنے والے دونوں ممالک ہندوستان اور پاکستان بہ طور مثال ہیں۔

نوآبادیاتی دور کی غلامی سے نجات حاصل کیے ستر سال سے زائد عرصہ بیت چکا ہے لیکن

پھر بھی نو آبادیاتی دور کی تہذیب و ثقافت، زبان، لباس، قانون، آئین علمی و ادبی نظریات، تعلیمی پالیسیاں جوں کی توں ہیں۔ فرانز فینن کے فکری نظریات سے صرف افریقی نو آبادیاتی آبادی کی ہی نشان دہی نہیں ہوتی بل کہ سامراجی نظام کے مدمقابل مزاحمتی بیانیے بھی سامنے آتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں قائم نو آبادیاتی نظام میں فینن کی فکر اسی لیے حقیقت کے زیادہ قریب ہے کہ اس میں ان درجات کو بہ آسانی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے جن کو طے کرنے کے بعد محکوم طبقات کے افراد غلامی کی زنجیروں کو اتار پھینکنے میں کامیاب ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ نو آبادیاتی دور کے ان کرداروں کا بھی اصل چہرہ سامنے آ جاتا ہے جو دراصل مقامی آبادی کو آزادی دلانے کی آڑ میں اپنے اپنے ذاتی مفادات کی جنگ لڑتے نظر آتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں قوم میں منافقانہ رویہ اپنائے ہوئے تھے۔

فرانز فینن کی پہلی کتاب ۱۹۵۲ء میں منظر عام پر آئی جس کا نام Peau Noire Masques Blancs ہے۔ اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ Black skin white masks کے نام سے کیا گیا۔ یہ کتاب افریقی نسل کے محکوم باشندوں کی نفسیات پر نو آبادکاروں کی طرف سے مرتب ہونے والے منفی اثرات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی تھی۔ اس کتاب میں افریقی باشندوں کے نفسیاتی جائزوں کو سامنے رکھتے ہوئے سامراج کی کھینچی گئی ان لکیروں کا واضح عکس دیکھا جا سکتا ہے جن کے تحت مغلوب و محکوم اور مظلوم باشندے ذہنی، نفسیاتی اور روحانی اذیتوں کا شکار ہو جاتے ہیں دراصل یہ کتاب فرانز فینن کے ان تجربات کی یادگار رہے جو انھوں نے الجیریا کے ایک ہسپتال میں سامراجی و استعماری ظلم و تشدد کا نشانہ بننے والے مظلوم افراد کے نفسیاتی معالج کے طور پر کیے۔ واضح رہے کہ الجیریا کو فرانسیسی استعمار کاروں نے اپنی استعماریت اور نو آبادیت کے نظام میں عرصہ دراز تک محکوم و مغلوب بنائے رکھا۔ ایک نفسیاتی معالج ہونے کے ناطے فینن نے اپنی تہذیب و ثقافت کے حوالہ سے ایک نبض شناس کے طور پر کام کیا یہی وجہ ہے کہ فینن کے نو آبادیاتی مطالعات میں اولین مقام حاصل ہے۔ فینن کے خیال میں سامراجی اور نو آبادیاتی

قوتوں کی طرف سے متعارف کرائے بیانیے مقامی باشندوں کی سیاسی وثقافتی، تہذیبی وتمدنی، علمی وفکری، ادبی وتخلیقی، سماجی ومعاشرتی، معاشی واقتصادی رویوں کو اس طرح رونڈ ڈالتے ہیں کہ مقامی آبادی کا ہر فرد ایک وجودی بحران کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور احساس کم تری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ نوآبادکار کی طرف سے مقرر کردہ یہ نسلی شناخت جو مقامی باشندوں جو جہاں احساس کم تری میں مبتلا کرتی ہے وہاں ان مقامی باشندوں کو خود کو ذات کی از سر نو دریافت کے لیے سوچ اور فکر مہیا کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ افریقی مقامی باشندے خود کے چہرے پر ایسا ماسک / خول چڑھانے پر مجبور ہوئے جس کے سبب وہ سیاسی، سماجی، معاشرتی، علمی، فکری اور معاشی سطح کی ترقی کے لیے اپنے نوآبادکاروں کے قریب ہوئے۔ برصغیر پاک وہند بھی نوآبادیاتی دور میں اپنے نوآبادکاروں اور مقامی باشندوں کے درمیان اس قسم کی مقبولیت اور مزاحمت کے عمل سے گزر چکا ہے اور نوآبادیاتی دور کی ایسی کارگزاریاں ہرگز ڈھکی چھپی نہ ہیں۔ فینن نے افریقی باشندوں کے لیے نسلی بنیادوں پر نیگرو (Negro) کی اصطلاح استعمال کرتا ہے جو دراصل ایک تخصیص ہے کہ اس سرزمین پر باقی ماندہ افراد کو نوآبادکار نے اپنی من مانی کی شناخت مہیا کی ہے۔ فینن اس پیچیدہ نوآبادیاتی حربے سے بچنے کے لیے مقامی باشندوں کو اپنی مقامی ثقافت سے جڑے رہنے اور اسی پر قائم رہنے کا مشورہ دیتا ہے۔ اس کے خیال یہی وہ عمل ہے کہ جس کے سبب مقامی باشندے نوآبادکاروں کے غالب آنے والے تہذیبی وثقافتی حربوں اور نسلی تفاخر ومنافرت کے مدمقابل کوئی مزاحمتی بیانیہ پیش کر سکتے تھے۔

فینن کی دوسری کتاب A Colonialism Dying (Ancique L') میں مقامی باشندوں اور حاکم نوآبادکاروں کے درمیان باہمی کش مکش کو بیان کیا گیا ہے۔ مزید برآں ان مدارج کو بھی بیان کیا گیا ہے جن کو طے کر لینے کے بعد کوئی بھی قوم کسی سامراج کی غلامی کی زنجیروں سے آزادی حاصل کر لیتی ہے اس کتاب کا بنیادی موضوع فرانسیسی نوآبادکاروں اور الجیریا کی مقامی آبادی کے باشندوں کے درمیان جاری کش مکش کا بیانیہ ہے جس نے بکھرے ہوئے

مقامی افراد کو نو آباد کاروں کے ظلم وتشدد کے خلاف اکٹھا ہونے اور مزاحمتی تدبیروں کا سامان کیا ہے۔فینن کے نزدیک جب مقامی باشندے ہر قسم کی طبقاتی تقسیم سے صرف نظر کرتے ہوئے آزادی کے لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں تو ان کے سامنے ظالم، جابر اور متشدد حکمرانوں کی حیثیت " کائی" کی سی ہوتی ہے۔اس اجتماعیت کے ساتھ ساتھ مختلف ذرائع ابلاغ بھی استعمار کار کے ظلم و تشدد اور جبر کے خلاف شعور اجاگر کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔ایسے میں یہ ذرائع ابلاغ برقی رو کا کردار ادا کرتے ہوئے مقامی افراد میں بجلیاں پیدا کرنے کا بھی سبب بنتے ہیں۔فینن کے مطابق یہ دونوں ذرائع ابلاغ نو آباد کاروں کے ظلم واستحصال سے نجات حاصل کرنے کے لیے آزادی کی جنگ میں مقامی مجاہدین آزادی کی آواز بن کر ان کی پکار کو دنیا کے سامنے لاتے ہیں۔ ہندوستان کی صورت حال کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا جائے تو ہندوستان کے نو آبادیاتی دور میں بھی اخبارات، رسائل، جرائد اور مقامی باشندوں کے جلسے جلوس اور ان میں پیش کردہ مزاحمتی بیانیے اور اس بیانیے کے عوض اپنی طلب نے آزادی کی راہ ہموار کرنے میں اپنا حصہ ضرور ڈالا ہے۔زمیندار، چٹان، اودھ پنچ اور ہلال جیسے رسائل وجرائد نے برطانوی نو آباد کاروں کے خلاف مزاحمت اور ان کے خلاف رائے عامہ قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ انگریز سامراج کی طرف سے مختلف پابندیوں، سزاؤں اور جرمانوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔فینن کے خیال میں جہاں یہ ذرائع ابلاغ مقامی افراد کے مرد حضرات میں جذبہ حریت پیدا کرتے ہیں وہاں یہ ذرائع ابلاغ مقامی عورتوں کو بھی تحریک آزادی میں شامل ہونے کا جذبہ بھی پیدا کرتے ہیں۔ان ذرائع ابلاغ کی چھان پھٹک سے جب تحاریک آزادی کی مرقوم داستانیں عام لوگوں کی دسترس میں آئیں تو وہ لوگ جوان نو آبادیاتی نظام کے استحصال کے خلاف صف آراء ہوئے تھے عوام کی نظر میں قومی ہیروز ٹھہرے۔فینن نے یہ بھی واضح کیا کہ تحریک آزادی کی جدوجہد میں نو آباد کاروں کی طرف سے متعارف کیا جانے والے بیانیہ بالآخر معدوم ہو جاتا ہے جن کا مقصد مغربی تہذیب و ثقافت کو فروغ دینا اور مقامی باشندوں کو ان کی مقامی روایات اور رسوم ورواج سے محروم کرنا ہوتا

ہے۔مقامی باشندوں کی تہذیب وثقافت نوآبادکاروں کی طرف سے تھوپی گئی تہذیب وثقافت کے سامنے اپنی مزاحمت جاری رکھتی ہے اور آخر کار سامراجی اور نوآبادیاتی تہذیب وثقافت کو جزوی یا مکمل بے دخل کرنے میں کام یاب ہو ہی جاتی ہے۔فینن کے الفاظ میں:

> ’’کسی بھی تہذیب کے بعض ستون انتہائی طاقت ور ہوتے ہیں جن کے سہارے وہ کھری ہوتی ہیں، انہیں اس قدر آسانی کے ساتھ نہیں ہلایا جاسکتا۔جب کہ استعمار نواز حلقوں کو مبالغہ آرائی کی حد تک اپنی کامیابی کی توقع ہوتی ہے‘‘۔(۱۱)

فینن نے اپنی اس دوسری کتاب میں تحریک آزادی کے دوران پیش آنے والی لسانی صورت حال پر دل کھول کر گفتگو کی ہے اس کی تحقیق کے مطابق سامراجی قوتوں کی متعارف کردہ زبان جو کہ مقامی باشندوں کے لیے ایک شجر ممنوعہ کی حیثیت میں ہوتی ہے، بالآخر آزادی کے لیے ایک ذریعہ بن جاتی ہے اور ایک آلہ کا کام دیتی ہے۔مقامی لوگ جب بدیسی زبان سے واقفیت حاصل کر لیتے ہیں تو بین الاقوامی سطح پر اپنا پیغام پہنچانے کے لیے اسی بدیسی زبان کا استعمال کرتے ہیں اور یہی حکمران زبان ان کے لیے ایک ہتھیار بن جاتی ہے۔اسی بدیسی زبان کو استعمال کرتے ہوئے سامراجی استحصال اور ظلم وستم کے خلاف ملکی و غیر ملکی اخلاقی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہندوستان میں انگریز سامراج کے آجانے سے مقامی آبادی نہ صرف انگریز سے نفرت کرتی تھی بل کہ ان کی زبان سے نفرت کرتی ہے اور اس کو ناپسند کرتی ہے۔ابتدائی طور پر برصغیر پاک و ہند میں بھی مقامی باشندوں نے انگریزی زبان سے اس حد تک احتراز کیا کہ مقامی علماء کرام نے انگریزی زبان کے سیکھنے کو کفر قرار دے دیا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مقامی آبادی کے افراد نے استعمارات کے استحصالی ہتھکنڈوں کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کے لیے نہ صرف انگریزی کو سہارا بنایا بل کہ اسی زبان کی وساطت سے اپنے مسائل دنیا کے سامنے رکھے جس سے ان کے سیاسی و ملی شعور میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔یہی ایک

بنیادی سبب تھا جس نے ہندوستان کے باشندوں کو انگریز سرکار کے خلاف اکٹھا ہونے پر مجبور کیا اور انھوں نے اپنے حقوق کی جنگ لڑنے کے لیے "اے ہیوم" نامی شخص کی سرپرستی میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ۱۸۸۵ء میں رکھی۔ اسی پلیٹ فارم نے ہندوستان کے لوگوں میں حقیقی رد استعمارات پیدا کیا گیا اور سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے ہندوستان میں جہاں انڈین نیشنل کانگریس کا وجود آیا وہاں مسلم لیگ کا قیام بھی اسی سلسلے کی کڑی ثابت ہوا تھا۔ ۱۹۰۶ء میں قائم ہونے والی سیاسی جماعت مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت بن کر ابھری۔ یوں کانگریس اور مسلم لیگ اور دیگر سیاسی جماعتوں کے قیام سے مقامی آبادی کی اجتماعیت نے نو آبادکاروں کے عزائم کو خاک میں ملانا شروع کیا اور آزادی اور انقلاب کے نعروں کی گونج بین الاقوامی ایوانوں تک پہنچی۔ نوجوان قیادت یورپ کے بڑے بڑے تعلیمی اداروں سے تعلیم مکمل کر کے لوٹی تو اسی استعماری زبان کو بہ طور ہتھیار استعمال کیا اور وقت نے ثابت کر دیا کہ زبان وادب نے ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔

فینن کی مشہور کتاب The Wretched of the Earth کا ترجمہ سجاد باقر رضوی اور محمد پرویز نے کیا۔ فینن کی اس کتاب نے علمی دنیا میں استعماریت اور سامراجیت کا اصل چہرہ بے نقاب کیا۔ اس کتاب میں فینن نے یہ نظریہ دیا ہے کہ نو آبادیاتی دنیا ثنویت کے تصور پر قائم ہے اور اس نظام میں سارا زور اسی بات پر ہے کہ ایک خاص نسل، رنگ، ملک، علاقے اور مذہب سے تعلق رکھنے والے افراد کو دنیاوی وسائل پر اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے پورا حق ہے جب کہ ان کے برعکس کسی دوسری نسل، علاقے، رنگ او رمذہب کے افراد ان کے ماتحت ہیں فینن نو آبادیاتی صورت حال کو ایک قسم کی اقتصادی صورت حال سے تشبیہ دیتا ہے۔ فینن کے مطابق:

> ”نو آبادیاتی صورت حال کی اصل جدت وہ اقتصادی حقیقت ہے جس
> میں اتنی شدید معاشی ناہمواری اور طرز زندگی کا اتنا بڑا فرق ہوتا ہے کہ
> انسانی صورت حال کی اس قدر پردہ پوشی کسی اور طریقے سے کبھی نہیں ہوتی

......نوآبادیات میں اقتصادیات کا زیریں نظام بھی ایک بالائی نظام ہوتا ہے۔سبب ہی نتیجہ ہوتا ہے۔آپ دولت مند ہیں اس لیے آپ سفید فام ہیں،آپ سفید فام ہے اس لیے کہ آپ دولت مند ہیں''۔(۱۲)

فرانزفینن کے درج بالا بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نوآبادیوں کے مقیم باشندے نوآبادکاروں کی طرف سے مسلسل استحصال کا شکار ہوکر بالآخر ایک قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ احساس کمتری صرف اسی صورت میں ختم ہوسکتا ہے جب انسان کو شرف آدمیت برابری کی سطح پر ہو۔اسی بنا پر نوآبادکار اپنا نظام ثنویت کے تصور پر قائم کرتا ہے تا کہ اپنی اجارہ داری قائم رکھ سکے۔ پہلے پہل مفاہمتی پالیسیوں کے مطابق مقامی، باشندوں کے دل میں احسان اور شکر گزاری کے جذبات اجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے بعدازاں استعمار کار اپنی چالاکیوں اور منافقانہ چالوں کے ذریعے اپنے اور مقامی باشندوں کے درمیان موجود تہذیبی و ثقافتی،علمی وادبی، سیاسی وسماجی اور علمی وفکری بُعد پیدا کر کے رہی سہی کسر بھی پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے یوں وہ مقامی آبادی اور خود کے درمیان دو دنیاؤں کیا یک الگ ذہنی ساخت پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔خود کو اعلیٰ اور مقامی آبادیوں کو ادنیٰ تر تصور کر لیا جاتا ہے۔ فرانزفینن کے مطابق اس دنیا کی تقسیم نسلی امتیاز کی بنیاد پر ہے۔مغربی لوگوں کے ہاں مشرقی باشندوں کے لیے ایک خاص قسم کی کشش ہے وہ یہ کہ مغربی لوگ خود کو دنیا کی اعلیٰ ترین نسل اور حکمران تصور کرتے ہیں جب کہ باقی تمام دنیا کو اپنا غلام اور محکوم خیال کرتے ہیں اور ان غریب طبقوں پر حکومت کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ یہی رویے مقامی باشندوں میں ہمہ وقت ایک اعصابی او رذہنی ہیجان پیدا کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔نوآبادکاروں کو ہمیشہ اپنے ان رویوں کے سبب مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہے اور اسی مزاحمت کے سبب نوآبادکار ہمہ وقت مقامی تہذیب،ثقافت، سماج،معاشرت اور مذہب سے خطرہ محسوس کرتا ہے۔ یہ کشش گریز،انجذاب وانحراف، مفاہمت و مخاصمت کے دورویہ جذبات صرف نوآبادکار اور مقامی باشندوں کی زندگیوں کو ہی نہیں بلکہ ان کے

خیالات اقدار و روایات، تحریر وتقریر اور رسوم و رواج غرض ہر چیز کو متاثر کرتے نظر آتے ہیں۔ نوآبادکاروں اور استعماری طاقتوں کی طرف سے مستعمل اصطلاحات "ہم" اور "وہ" اعصاب پر اس حدتک اثرات مرتب کرتی ہیں کہ مقامی باشندے نوآبادکاروں کے استعمار سے چھٹکارا حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ان جیسا بننے کے خواب بھی دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

فینن نوآبادیاتی صورت حال کے سمجھنے کے لیے علمی سطح پر مقامی لوگوں کے علمی سرمائے کا تجزیہ کرنا لازمی خیال کرتا ہے تاکہ پتہ چل سکے کہ نوآبادیاتی صورت حال کو رد کرنے کے لیے مقامی باشندوں نے نوآبادیاتی بیانیے کو کس طرح رد کیا یا اس کو اپنا لیا۔ وہ کون سے ذہنی عوامل تھے جنھوں نے "وہ" اور "ہم" کا فرق پیدا کیا اور اس کے لیے ذہنی فضا تیار کی۔ آخر کیوں استعمار کار اپنی تہذیب وثقافت اور علم وادب کو اعلیٰ ترین خیال کر کے اپنا فکری نظام رائج کرنا چاہتے تھے۔ وہ کون سی وجوہات تھیں جن کے تحت نوآبادکار اور اس کی تہذیب وثقافت سے مخاصمت کی بجائے مفاہمت کی راہیں نکلتی تھیں۔ فینن کا خیال تھا کہ بعض مقامی ادیب ومفکر اپنے ذاتی مفادات کے حصول کے لیے استعماری سرمایہ داروں سے کوئی نہ کوئی خاص تعلق رکھتے ہیں اسی تعلق کے نتیجے میں ان ادیبوں کی تحریروں میں استعماری طاقتوں کے بیانیے، تاریخ، خیالات، نظریات اور تہذیب و ادب کے روشن پہلو نمایاں نظر آتے ہیں۔ فینن کے خیال میں ان مقامی ادیبوں اور مفکرین نے بڑے عہدوں اور خطابات کے حصول کے لیے اپنے خاص تعلق کو نوآبادکاروں اور استعماری طاقتوں سے استوار کیسے رکھا۔ برصغیر پاک وہند کے نوآبادیاتی دور کے لکھے جانے والے ادبی سرمائے میں ایسی تحریریں مل جاتی ہیں جن کا مقصد صرف اور صرف سامراجی حکمرانوں کی قربت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد جو ادب تخلیق ہوا وہ جہاں مزاحمتی تھا وہاں ایسا ادب بھی تخلیق کیا گیا جس کا مقصد صرف اور صرف انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنا اور انگریزوں کی قربت تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریزوں کو مقامی زبان سے متعارف کرانا بھی مقصود تھا۔ ان تحریروں میں نہ صرف انگریز کو ایک نجات دہندہ کے طور پر پیش کیا گیا بلکہ اس کے مقابل مقامی

حریت پسندوں کو اوباشوں، لیٹروں، جور، ڈاکوؤں جیسے القابات سے نوازا گیا۔ اس وقت کے مقامی تخلیق کاروں اور شاعروں نے اپنی جان بچانے اور ذاتی مفادات لینے کی خاطر نئے حکمرانوں سے مفاہمت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اس نوآبادیاتی دور کی لکھی ہوئی تحریریں سنہرے دور کی ایک علامت کے طور پر ابھرتی ہیں۔ ان تحریروں میں نوآبادکار کی طاقت اور قوت کے رعب کو ایک مسیحائی کا انداز دیا گیا ہے۔ ایسا نجات دہندہ جسے قدرت نے تباہ حال قوم کی اصلاح اور خوش حالی کے لیے بہ طور تحفہ اور انعام بھیجا ہو۔ نوآبادیات کے عہد میں نوآبادکاروں کے بنائے ہوئے قوانین، اصلاحی ایجنڈے اور ادب پروری غرضیکہ ہر چیز کو صرف اور صرف ذاتی مفاد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اپنی تہذیب وثقافت، رسوم ورواج، علم وادب روایات واقدار اور سیاسی و سماجی شناخت کو نوآبادکاروں کے ہاں گروی رکھوا کر ہی کوئی قوم اپنی شناخت، قومیت اور آزادی کے مفہوم کی حقیقت سے واقف ہوتی ہے۔ فینن قومیت کا یہی شعور مقامی افراد میں نئے سرے سے پیدا کرنے کے بعد آزادی کی تحریک پر آمادہ کرتا نظر آتا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں:

> ''عوام جو اپنے پیدائشی حقوق کھو چکتے ہیں، خود خانہ جنگی اور عداوتوں کے چھوٹے چھوٹے دائروں میں رہنے کے عادی ہو چکتے ہیں۔ اب مختلف علاقوں میں قوم کے چہرے کو صاف اور شفاف کرنے کے لیے قیامت کی فضا میں آگے بڑھتے ہیں''۔ (۱۳)

درج بالا بیان نوآبادیوں کے مقامی باشندوں کی اس بے ساختگی کو ایک قوت سے تعبیر کرتا ہے۔ ان مقامی لوگوں کا یہی شعور ظالم وجابر سامراج کے خلاف اٹھ کھڑا ہونے کی قوت فراہم کرتا ہے۔ آپس کے اختلافات کو بھلانے اور اتحاد پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ اتحاد اور اجتماعیت ہی سامراج سے آزادی حاصل کرنے میں مدد کرتا ہے۔ برصغیر پاک وہند کے لحاظ سے میثاق لکھنؤ وہ وقت تھا جس نے ہندوستان کے لوگوں میں انگریز سامراج کے خلاف مشترکہ جدوجہد اور انگریز کے جاری کردہ ظلم وستم اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے کا حوصلہ دیا۔ اس

مشترکہ جدو جہد کو حقیقی معنوں میں قومی شعور کی بیداری کا نقطہ آغاز قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہوم رول، تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات تک مقامی آبادی جس انداز میں انگریز سامراجی قوت کے خلاف متحد ہوگئی تھی اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اب آزادی کی منزل زیادہ دور نہیں لیکن گاندھی جی کے فلسفہ عدم تشدد کا حامی ہونے اور سانحہ چوراچوری میں مقامی باشندوں کے ہاتھوں ایک تھانے پر دھاوا بولنے کے سبب تحریک ترک موالات کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا واضح رہے کہ چوراچوری کے سانحہ میں مقامی افراد کے ہاتھوں تھانے آگ لگا دی گئی تھی جس کے نتیجہ میں ۲۲ کے لگ بھگ سپاہی جل کر ہلاک ہو گئے تھے۔ گاندھی جی کی طرف سے تحریک ترموالات کے خاتمے کے بعد ایک مدت تک مسلمان اور ہندو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے نہ ہو سکے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ آزادی کی منزل کوسوں دور چلی گئی۔

فینن کے ہاں نوآبادیاتی نظام میں نوآبادکاروں کے ظلم وتشدد کا مقابلہ کرنے کے لیے متشدد مزاحمت اس وقت ناگزیر ہو جاتی ہے جب کوئی اور چارہ باقی نہ رہے۔ نوآبادکار ہمیشہ مختلف قوانین اور طاقت کے اندھا دھند استعمال سے جب مقامی آبادی تحقیر کا نشانہ بناتا ہے اور موقع بہ موقع عزت نفس کو مجروح کرتا ہے۔ اس عمل سے وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ مقامی آبادی کے افراد کی حیثیت کسی جانور کی سی ہے۔ نوآبادکاروں کی طرف سے وضع کردہ مخصوص اصطلاحیں جیسا کہ نیگرو (Negro) اور نیٹو (Native) ان کی مخصوص ذہنیت کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان اصطلاحوں کے ذریعے نوآبادکار مقامی افراد کے ذہنی اور جسمانی استحصال کا حق اپنے پاس رکھ لیتا ہے۔ مسلسل استحصال، ظلم وستم، بربریت اور جانوروں سے بھی بدتر سلوک برداشت کرنے کے بعد کسی بھی نوآبادی کے باشندوں کی طرف سے تہذیب وشائستگی اور امن وسلامتی کے لہجے کی امید رکھنا پرے کا خیال ہے۔ ظلم وستم بربریت اور استحصال کی اس صورت حال میں تحریک آزادی کی کاوش اور اس جدو جہد کے دوران کسی بھی گروہ سے بھڑکنے والی تشدد کی کوئی ایک چنگاری پورے سماج کو آناً فاناً آگ کے جنگل میں بدل دیتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران واقع ہونے والے کئی

ایک واقعات اسی آگ کی چنگاری کا کام کر گئے جنھوں نے برصغیر پورے کو خاک وخون میں نہلا دیا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اگر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں برصغیر پاک وہند کی جملہ آبادی اور سیاسی وسماجی گروہ مشترکہ متشدد مزاحمت کی راہ اختیار کرتے تو تاریخ کی سمت کسی اور طرف ہوتی اور حالات یکسر مختلف ہوتے۔ فینن نوآبادیاتی نظام کو ایک قسم کا تشدد خیال کرتا ہے جیسا کہ مشہور کہاوت ہے "لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے" البتہ فینن کے ہاں ایسے نوآبادکاروں اور سامراجیت کے اداروں کے لیے لچک ملتی ہے جو نوآبادیاتی نظام میں بربریت، ظلم اور استحصالی ہتھ کنڈوں کا حصہ نہیں بنتے۔ فینن کے بقول:

> ''نوآبادکار ہمیشہ ایسا انسان نہیں ہوتا جسے قتل کر دینا چاہیے۔ استعماریوں کے انبوہ میں بہت سے ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جو قوم کے بعض سپوتوں سے کہیں زیادہ بڑھ کر قومی جدوجہد کے قریب ہوتے ہیں''۔ (۱۴)

فینن نوآبادیاتی دور کی اقتصادی صورت حال کو پرکھنے کے لیے مقامی آبادی اور حکمرانوں کے متوسط طبقے کے افراد کی ذہنی حالت کا موازنہ کرتا ہے۔ اس کے مطابق مقامی افراد کا متوسط طبقہ نوآبادکاروں کے متوسط طبقہ سے منسلک ہونے کو لازمی خیال کرتا ہے تاکہ نوآبادکاروں کے استعماری نظام کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا جا سکے یہی وہ طبقہ ہے جو اپنے مالیاتی مفادات کو برقرار رکھنے کے لیے نوآبادکاروں کے جاری کردہ استحصالی بیانیے کو جاری رکھنے پر اصرار کرتا ہے۔ فینن کے مطابق مقامی آبادی کے وہ افراد جو قومیت پر پکے ہوتے ہیں بعض اوقات وہ بھی سامراجیت کے بنائے ہوئے راستوں پر چل نکلتے ہیں اور نوآبادیاتی عہد کے خاتمے کے بعد بھی تسلیم شدہ حکومت میں بھی اسی کٹر قومیت کا متوسط طبقہ اپنی اجارہ داری پھیلانے میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتا رہا ہے۔ مزاحمت اور نوآبادیت کی مخالفت کے مختلف مدارج میں اس نکتہ کو نشان زد کیا جا سکتا ہے کہ مقامی آبادی کے متوسط طبقہ کی ذہنیت اور نفسیات پر عموماً سامراج اور استعماریت کے متوسط طبقہ کے اثرات کی واضح چھاپ موجود ہوتی ہے۔ اس متوسط طبقہ کے علاوہ وہ سیاسی

جماعتیں اوران کے لیڈران کا کردار بھی قابل ذکر ہے جوآزادی حاصل کرنے کے بعد کسی بھی ملک کی باگ ڈورسنبھالتے ہیں۔فینن ایسے کرداروں کونشان زد کرتا ہےاورمشورہ دیتا ہے کہ نئی قومی حکومت کے قائم ہوتے ہی ان سیاسی جماعتوں کے ان لیڈران کوردِاستعماریت کے ایسے بیانیے وضع کرنے چاہیں جونوآبادیاتی دور کے استحصال کے اثرات کوزائل کرنے میں مددگار رہوں۔قومی تہذیب اورثقافت،علمی وادبی فکر کا فروغ ہی نئی آزاد ہونے والی ریاست کے افرادکوان کی پرانی تہذیب وثقافت،علمی وادبی، سیاسی اورسماجی، معاشرتی ومعاشی اوراقتصادی روایات سے منسلک ہونے اورقدیم قومی روایات کودوبارہ زندہ کرنے میں اپنا کردارادا کرسکتی ہےاورنوآبادکاروں کے مسخ کردہ حقائق اورشناخت کواز سرنو قائم کرنے کی کوشش کرسکتی ہے،فینن کے اپنے الفاظ کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

> ''استعماریت محض مقبوضہ ملک کے حال اور مستقبل پر تسلط جمانے پر ہی قناعت نہیں کرتی، استعماریت صرف عوام کو اپنی گرفت میں لے کر اور مقامی باشندوں کے ذہن کوصورت اورمعنی سے خالی کرکے ہی مطمئن نہیں ہوجاتی بلکہ ایک طرح کی غیرصحت مندانہ منطق سے کام لیتے ہوئے یہ مظلوم عوام کے پیچھے پڑجاتی ہےاوراسے مسخ کرکے بدہیئت اورتباہ کردیتی ہے''۔(۱۵)

فینن استعماریت اورنوآبادیاتی نظامی کی تہذیب وثقافت کے منفی پہلوؤں سے بچنے کے لیےقومی تہذیب اوراپنی اصل ثقافتی جڑوں کومضبوطی سے تھامے رکھنے پرزوردیتا ہے۔اس کے مطابق نوآبادیاتی دورمیں مقامی ادیب ودانش وربیک وقت دوتہذیبوں کے ہونے کی وجہ سے دوغلاپن کا شکار ہوجاتا ہےاوراسی دوغلے پن کے سبب ہمہ وقت دوشناختوں میں الجھ جاتا ہے۔ اردوادب میں بہت سارے تخلیق کاراس الجھن میں گھرے نظرآتے ہیں اس الجھن کے سبب ادبی متون کافی پیچیدہ ہوجاتے ہیں۔اس صورت حال میں ادیب اوردانش وروں کی تخلیقی صلاحیتیں

فطری اظہار سے معدوم ہو جاتی ہیں لیکن یہ کالی رات سدا نہیں رہتی بالآخر یہ بادل چھٹ جاتے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ مزاحمتی اور رد استعماری رویے پروان چڑھتے ہیں تو ادیب اور تخلیق کار اپنی حقیقی اور فطری شناخت کا تعین کرنے اور واضح کرنے میں بالآخر کامیاب ہو ہی جاتے ہیں۔ مزاحمتی رویے اور مزاحمتی بیانیے استعماریت اور سامراجیت کی اثر سے آزاد کرانے کے بعد کسی بھی مقامی آبادی کو اس کی اصل تہذیبی شناخت سے منسلک کرتے ہیں جو ان کی ذات اور مقام و مرتبے کا اصل اظہار کرتی ہے۔فینن نو آبادیاتی دور میں لکھی جانے والی ادبی تحریروں کو تین ادوار میں تقسیم کرتا ہے۔

۱۔ ابتدائی دور کی ادبی تخلیقات جو نو آبادکاروں کی لائی ہوئی تہذیب و ثقافت کی مخالفت کی بجائے نو آبادیاتی تہذیب کو غیر مشروط انداز میں اپنے اندر جذب کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ نو آبادکاروں کے قریب ہونے کے لیے مقامی ادیب اور دانش ور نو آبادکاروں کے ادب سے براہ راست اثرات کو جذب کر کے انھی کے رنگ میں ڈھلنے کی کوشش کرتے رہے اور انھی کی طرز پہ ادب تخلیق کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔اس ضمن میں ہندوستان میں انجمن پنجاب کا قیام اور اس پلیٹ فارم سے پیش کردہ نظمیہ شاعری کو جدید اردو نظم کے طور پر پیش کرنا عمدہ ترین مثال ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مغربی نظموں کے تراجم اور مقامی شاعری کو مغربی شاعری کے معیار پر پرکھنا،خود کی شاعری کو ناقص اور انگریزی شعرا کی شاعری کو برتر خیال کرنا بھی اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں جن کا اثر آج تک محسوس کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ نو آبادیاتی دور کے دوسرے دور میں ادیب اور دانش ور اپنی کھوئی ہوئی ساخت، شناخت اور گم شدہ حصوں کی دریافت اور ردوبارہ بحالی کی کوشش کرتا ہے۔ ماضی کی تلاش میں سرگرداں ہوتا ہے اور ماضی میں خود کو لے کر جا کر خود کو دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اسے اس وقت احساس ہوتا ہے کہ غلامی واقعی ذلت اور پستی کا نام ہے وہ لمحے کسی نعمت سے کم نہ تھے جب استعماریت کا نام و نشاں تک نہ تھا۔فینن کی تحریر کے مفہوم کی روشنی میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ:

''بچپن کے گزرے ہوئے واقعات اس کی یادوں کی گہرائیوں سے نمودار ہوتے ہیں۔ مستعار جمالیات اور دیگر آسمانوں کے نیچے دریافت شدہ نظریاتِ زندگی کی روشنی میں پرانے قصے کہانیوں کی نئی تعبیریں ہونے لگتی ہیں''۔(۱۶)

اس بیان کی روشنی میں بیسویں صدی کی ابتدائی قومی اور ملی نظم کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔اس پوری نظمیہ شاعری میں ماضی کا شکوہ اپنی جھلک پیش کرتا نظر آتا ہے۔اس نظم میں طنزومزاح، تمثیلی عناصر ادب میں مایوسی اور شکست جیسے تجربات کا ردعمل قرار دیے جاسکتے ہیں۔ ہندوستان میں نوآبادیاتی دور کے اس دوسرے ادبی عہد میں تمثیل نگاری کے ساتھ ساتھ طنزومزاح کے میدان میں اردو نظم کے علاوہ جس صنف نے اپنے حصہ ڈالا ان میں پنچ اخبار سرفہرست ہیں۔ خاص کر اودھ پنچ اخبار اس میں طنزومزاح اور تمثیلی قصوں کو پروان چڑھانے میں نوآبادیاتی نظام کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں اور جاری کردہ تعزیروں اور قوانین نے سب سے اہم کردار ادا کیا۔ البتہ مقامی نظم گوشعرا میں اکبرالہ آبادی کی شاعری طنز اور مزاح کے پیرائے میں سامراجیت اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف علم بلند کرنے والے لوگوں میں صف اول کی حیثیت رکھتی ہے۔

۳۔ مزاحمتی بیانیے اور رد استعماریت کے زمرے میں نوآبادیاتی دور کا تیسرا اور آخری دور حقیقی طور پر ہی انقلاب اور بیداری کا دور تھا۔اس دور میں حقیقی جنگجو، انقلاب اور قومی وملی ادب تخلیق ہوتا ہے۔فنون لطیفہ جیسا کہ مصوری، مجسمہ سازی وغیرہ کے تمام فنون کے علاوہ شاعری کی جملہ اقسام جو نوآبادیاتی عہد کے ظلم وستم، استحصال اور جبر کے سبب اپنا اصل رنگ ڈھنگ کھو چکی ہوتی ہیں۔اس آخری دور میں سبھی دوبارہ اپنی اصل کی طرف لوٹ آتے ہیں اور تہذیب وثقافت کے قدیم رنگ بکھیرنا شروع کردیتے ہیں اور چلتے چلتے اپنی قدیم روایت سے جڑ جاتے ہیں۔اس دور میں پیدا ہونے والا ادبی ذوق داخلی جبر اور خارجی انتخاب کا مجسم ہوتا ہے۔اس ذوق کے سبب تخلیقیت نئے رنگ اور آہنگ سے مزین ہوکر نمودار ہوتی ہے۔وہ شعرا جو ابتدا میں نوآبادیاتی رعب

اور دبدبے اور نوآبادیاتی بیانیے سے مرعوب و متاثر ہو کر نوآبادکاروں کے گن گاتے نظر آتے تھے، یکسر بدل جاتے ہیں اور اپنی شاعری عوامی مسائل کو موضوعِ سخن بناتے ہیں۔ موضوعات بدل جاتے ہیں۔ عوامی مسائل کا چرچا ہوتا نظر آتا ہے۔ اس دور کے مقامی ادبا و شعرا مقامی تہذیب و ثقافت، روایات و اقدار کو ان کے ماضی کے جھروکوں سے نکال کر جدیدیت کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ فینن کے مطابق یہ دور نئی امنگوں اور امیدوں کا ترجمان ہوتا ہے۔ وہ ادیب کو مشورہ دیتا ہے کہ اس دور کے ادیب کو چاہیے کہ وہ ماضی کو مدنظر رکھتے ہوئے مستقبل کی پیش گوئی کرے اور مستقبل کے لیے نئی نئی راہیں تلاش کرے، قوم کو ماضی کے اندھیروں میں دھکیلنے کی بجائے امید و یاس اور رجائیت کا راستہ دکھائے تاکہ مقامی آبادی خود کے قدموں پر کھڑا ہو سکے اور غلامی کا جو طوق انھوں نے گلے کا ہار بنا کر پہن رکھا ہے اس کو اتار پرے کریں اس حوالہ سے ہندوستان میں بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں لکھی جانے والی اردو نظم اس تیسرے عہد کی عکاس ہے۔ اس تیسرے اور آخری عہد کے نظم گو شعرا کی نظمیں جہاں اپنے ماضی اور مقامی ہیروز کی یادوں میں اپنائیت کا احساس دیتی ہے وہیں مزاحمت اور مزاحمتی بیانیوں کا تاثر دیتی بھی محسوس ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کے منظوم ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے نوآباد کاروں اور نوآبادیاتی نظام کے اصول و قوانین، جبر، استحصال اور عفریت کے مخالف لہجہ سخت بہ آسانی سمجھ آتا ہے۔

نوآبادیاتی صورت حال جو کسی آبادی کی انفرادی شناخت اور قومی تہذیب و ثقافت کو ذہنی و جسمانی سطح پر کچلنے کے بعد اپنی شناخت اور تہذیب و ثقافت کا ملمع کرتی ہے۔ فینن اس ملمع کاری اور اس کے اثرات سے نجات کے لیے مقامی آبادی کی طرف سے مسلسل جدو جہد اور سیاسی و سماجی، معاشی و معاشرتی، اور علمی و ادبی میدانوں میں قومی و ملی تہذیب و ثقافت اور روایات و اقدار کے شعور کو اجاگر کرنے پر بھرپور زور دیتا ہے۔ اس کی فکر نوآباد کاروں کے وضع کردہ ان تمام سیاسی، سماجی، ثقافتی، علمی و ادبی اور معاشرتی بیانیوں کی چھان بین کرنے پر اصرار کرتی ہے۔ واضح رہے کہ

نوآبادکار کی طرف سے ایسے بیانیوں کا مقصد صرف اور صرف مقامی سطح پر آبادی کے افراد میں شناخت کے حوالہ سے احساس کم تری پیدا کرنا اور اس احساس کے سبب اپنے اقتدار کو عروج دینا اور راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کرنا تھا۔فینن نے مغربی نوآبادکاروں کے انھی منافقانہ رویوں اور معاشی وسائل پر اپنی اجارہ داری کی تدبیروں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔مزید یہ کہ انھوں نے اپنی اس فکر سے محکوم قوموں کو اپنی تہذیبی وثقافتی جڑوں کی تلاش اور دریافت پر آمادہ کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔فینن کے ہاں موجود اس نوآبادیاتی نظام کو اس کے معروضی سیاق وسباق میں دیکھتے ہوئے مزاحمت اور مزاحمتی بیانیوں کو پرکھا جا سکتا ہے۔اردو زبان وادب میں پس نوآبادیاتی مطالعہ کرتے ہوئے فینن کی فکر اور نظریاتی پختگی کو مدنظر رکھنا فکر وفن کے حوالہ سے نئے زاویے اور نئی راہیں دکھا سکتی ہے۔

تاریخِ عالم پر نظر دوڑائیں تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ نوآبادیاتی نظام کا باقاعدہ آغاز پندرھویں صدی عیسوی کے اختتام پر نشاۃ ثانیہ کی لہر سے ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ کولمبس جس نے ہندوستان کا راستہ تلاش کرنے کے لیے۱۴۹۲ء میں اپنے سفر کا آغاز جزائر کنیری سے کیا۔اسے ایک طویل اور حوصلہ شکن سمندری سفر درپیش تھا جس کا اور تھا نہ چھوڑ،لیکن نشاۃِ ثانیہ کے عطا کردہ عزم کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ایک دن جہاز ران بالکل مایوس ہو کر بغاوت کی سوچ رہے تھے کہ دور مغرب میں نیلے آسمان پر آبی پرندے اڑتے نظر آئے۔مایوسی،امید اور مسرت کی لہر میں تبدیل ہو گئی۔سرسبز وشاداب "بہاما" جزائر کا سلسلہ اب ان کے سامنے تھا۔امریکہ کی دریافت نے ایک نئی نویلی سرزمین کا دروازہ یورپی اقوام پر کھول دیا۔ایک براعظم شمال میں تھا تو دوسرا جنوب میں۔ان براعظموں کے درمیان میں لاتعداد جزائر جو "باغِ عدن" کا نمونہ پیش کر رہے تھے،معدنی ذرائع سے مالا مال۔اگر شمال میں قطب شمالی کے برف زار تھے تو جنوب کے علاقے قطب جنوبی سے ملتے تھے۔یورپی اقوام کی قسمت ہی بدل گئی تھی۔ان کو سیم وزر اور مال و دولت سے لبریز خزانوں کا راستہ مل گیا تھا گویا Treasure Island تھا جس کا نقشہ ان کے

ہاتھ آ گیا تھا۔ رابرٹ لوئس سن کے ناول "ٹریژر آئی لینڈ" کو اس دلچسپ صورتِ حال کا بلیغ استعارہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس قبضہ میں مفتوحہ سرزمین پر جس بربریت کا مظاہرہ کیا گیا اس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کی جزائر "بہاما" کے بہت سے سرخ فام امریکی قبائل" کولمبس" کے دورِ اقتدار میں ہی صفحہ ہستی سے مٹا دیے گئے۔ کولمبس نے صرف "امریکہ" کو ہی نہیں دریافت کیا تھا بل کہ یورپ کے لیے سونے کے شہروں کا راستہ بھی کھول دیا تھا۔ نئے براعظموں کی دریافت سے جہاں سائنسی علوم کو پروان چڑھانے کے لیے زبردست مواقع میسر آئیو ہاں نو آبادیاتی نظام اور مسیحی مشنریوں نے آکاس بیل کی طرح پوری دنیا کو گرفت میں لے لیا۔ تمام محکوم اقوام کے قدرتی وسائل یورپی شہروں میں کھنچتے چلے گئے۔ ہندوستان جو کہ ہزار ہا سال سے خوش حال ملک تھا کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے لوٹ لوٹ کر کنگال کر دیا۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے جن علاقوں میں کبھی قحط نہیں پڑا تھا وہاں بھی لوگوں کو افلاس وادبار نے آلیا۔ استعماری نظام کا میکانزم بلاشبہ استحصال پر قائم ہوتا ہے۔

نو آبادیاتی نظام کو دنیا پر غلبہ پانے میں دو نفسیاتی محرکات کا بنیادی کردار رہا ہے۔ پہلا محرک یورپی اقوام کا مذہبی تفاخر تھا۔ ان کا ہمیشہ سے یہ اصرار رہا ہے کہ عیسائیت دنیا کا اعلیٰ ترین مذہب ہے اس کے علاوہ نجات کے سارے راستے گمراہ کن اور باطل کی پیداوار ہیں۔ دوسرا محرک دینا کی برتر نسل ہونے کا شدید احساس قرار دیا گیا ہے۔ یورپی اقوام کو پختہ یقین تھا کہ باقی تمام اقوام انسانی ارتقا کے حوالے سے یورپی اقوام کے مقابلے میں دوسرے درجے کی مخلوق ہیں مزید یہ کہ کم عقل اور بدحال۔ چناں چہ ہر وہ شخص جس کی آنکھیں نیلی اور رنگ سفید تھا، خود کو Super Man تصور کرتا تھا۔ ستاروں سے اتری ہوئی کوئی اعلیٰ مخلوق جس کے کندھوں پر خدا اور فطرت کی جانب سے یہ ذمہ داری ڈال دی گئی تھی کہ دنیا بھر کے کم تر انسانوں کو تہذیب سکھائے۔ اسی طرح بگاڑ کی ایک صورت اور بھی سامنے آئی وہ یہ کہ فلسفے کی تعلیم نے نیکی اور خیر کو انسانی عمل کا قانونِ مطلق قرار دیا۔ " کانٹ" نے اس قانون کو کچھ اور معنوں میں استعمال کیا تھا لیکن یورپی اقوام نے

اسے مطلق قانون کی حیثیت میں استعماریت کا جواز قرار دے دیا۔نوآبادیات کا فلسفیانہ جواز یہ فراہم کیا گیا کہ نوآبادیت دنیا کو خیر وفلاح اور روشنی کی طرف بلانے کے لیے قائم کی جا رہی ہیں۔ اصل مقصد پس ماندہ اقوام کو یسوع مسیح کے سایہ رحمت میں لانا ہے۔یوں نوآبادیاتی جنون کا دوسرا رخ مذہبی جنون کی صورت میں سامنے آیا۔بین الاقوامی سطح پر استعماریت کے جنون کو ہتھیار کے طور پرخوب استعمال کیا گیا۔ہندوستان میں مشنری ادارے ایسٹ انڈیا کمپنی کی معیت میں وارد ہوئے نوآبادیاتی عہد کی ساری جدوجہد کی بنیاد ڈارون کا دیا ہوا"بقائے اصلح" کا قانون تھا جسے مذہبی تکبر، نسلی تفاخر اور سائنسی علمیت کے منفی تصور پر استوار کیا گیا۔اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اٹھارہویں صدی سے انیسویں صدی تک یورپی نوآبادیات ظلم وستم کی منڈیاں بن گئیں۔اس دوران تیسری دنیا میں فکری اور روحانی غلام کاری کا شرمناک کاروبار اپنے عروج پر تھا۔ازمنہ وسطیٰ سے یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ مذہب اور سائنس دونوں ایک ہی مقصدیت کی پیروی کرتے ہیں۔دونوں کا مقصود انسانیت کی فلاح ہے۔یہ دعویٰ خاص طور پر کیا گیا کہ سائنس اپنے دائرہ کار میں انسانی ترقی اور فلاح کا دوسرا نام ہے۔یہ دونوں انسان کی منطقی اور اخلاقی ضرورت ہیں اور اخلاقی ذمہ داری بھی۔ اسی بنا پر نوآبادیاتی نظام کے ان دونوں مثبت مقتضیات کی آڑ میں یورپی اقوام نے انسانیت کو عقب میں دھکیل کر مطلب براری اور موقع پرستی کو فوقیت دی۔یہ طے ہوا کہ جو سفید فام نہیں وہ ازل سے نیچ اور رذیل ہے، جو مسیحیت کو تسلیم نہیں کرتا وہ دوزخی، لعنتی اور گردن زدنی ہے۔اسی طرح شیطان صفت پادریوں اور فرعون صفت یورپی حکمرانوں نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔مسیحیت کو دنیا بھر میں پس ماندہ اقوام میں فروغ دیا تاکہ استعماریت کے ایجنڈے کو فروغ دیا جا سکے۔ انسانیت کی تذلیل جس شرم ناک طریقے سے کی گئی اس کی ہول ناک تصویر انگریزی ناول The weeping woods میں بڑی چابک دستی سے کی گئی ہے۔افسوس نشاۃ ثانیہ سے شروع ہونے والا روشن خیالی کا یہ ایجنڈا نوآبادیاتی بہمیت اور معاشی ومعاشرتی،نفسیاتی، اقتصادی اور نسلی استحصال پر اختتام پذیر ہوا۔

نوآبادیات کو مابدل جدید فکری جہات کا ایک امتیازی جزو خیال کیا جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو مابعد نوآبادیت کی اصطلاح بھی نوآبادیاتی فکر کا معروضی انداز کا تجزیہ کرتی ہے اور اس تجزیہ سے حاصل ہونے والے نتائج اور حاصلات کی ترتیب وتعیین کے متعلق سرگرمیوں کا احاطہ کرتی ہے۔ مابعد نوآبادیت کا مطالعہ نوآبادکار اور نوآبادیاتی باشندوں کے باہمی میل جول اور استحصالی صورت حال میں مقتدر اور ماتحت کلامیوں کی فکری آویزش کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کا نام ہے۔ معاصر عہد میں نوآبادیاتی حربوں اور استحصالی ہتھ کنڈوں کے جدید نظام پر غور وفکر بھی مابعد نوآبادیتی مطالعہ کا حصہ ہے۔ برصغیر پاک وہند براہِ راست غلامی کی صورتِ حال سے گزر چکا ہے اور اردو زبان کا وجود اسی کے دم سے ہے۔ اس لیے اردو کے شعر وادب میں خاص اردو نظم میں مابعد نوآبادیاتی مطالعہ کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

نوآبادیاتی نظام کے ظلم وستم اور استحصال سے تنگ عوام ومحکوم طبقہ نے اپنے نظریات، معاشرے اور ثقافت کو بچانے کے لیے ہمیشہ ردعمل کی تحاریک اور مزاحمت کا سہارا لیا ہے اور ان کے اثر سے آزادی کی منزل کی طرف گامزن ہوئے۔ جہاں یورپی اقوام ترقی اور بیداری، روشن خیالی اور سائنس کو دنیا کے سامنے پیش کرنے میں کامیاب ہوئیں وہاں انسانوں کو ذہنی غلامی وپستی اور جبر واستحصال کے نظام سے بھی متعارف کرا گئیں۔ انسانوں کو طبقات میں تقسیم کرنے کے بعد اجارہ داری کرنے کا ڈھنگ اور اسلوب بھی دنیا کو دیتے ہوئے دنیا کو پہلی، دوسری اور تیسری دنیا میں منقسم بھی کر گئیں۔ اس جبر اور استحصال کے خلاف پوری دنیا کے ادبا، محققین، نقاد اپنی رائے دینے پر مجبور ہو گئے۔ پندرھویں صدی سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ آج اکیسویں صدی میں فلسطین، عراق، کشمیر، افغانستان اور شام تک کے علاقوں کو اپنے نرغے میں لیے ہوئے ہے۔ تاریکی، جبر، ناامیدی اور ظلم وستم کے اس دور میں عوام کے دلوں میں روشنی اور جدوجہد کی شمع روشن رکھنے کے لیے ادیب اور شاعر اپنے حصہ کا کام کرنے میں آج بھی مصروف ہیں جیسا ماضی کے ادبا اور شعرا کے ہاں ملتا ہے۔ ادب کسی بھی زبان کا ہو مزاحمت اور ردعمل کے طور پر جب بھی تخلیق ہوا

اس کے خالق کو ہمیشہ بھگتنا پڑا۔گارشیا لوکا، ڈیوڈ گیٹ، بنجمن مولوٹس،فرخی یزدی،محمد رضا عشقی،سارتر،محمود درویش، آندرے مالرو،ناظم حکمت، رومین رولاں، کریم پور شیرازی، مرتضٰی کیوان،حمد بہرنگی،جلال الاحمد،احمد شاملور،علی شریعتی اور پروین اعتصامی کے ساتھ ساتھ لوشون، اے چھینگ، ماؤدون، لاؤشے، چولی بو، ابراہیم طوقان، رشید سلیم الخوری،محمد علی الحومانی،سمیع القاسم،سلمٰی الخضر ،کمال ناصر،جبرا ابراہیم جبرا،توفیق صانع،لیلٰی خالد،بورس پاستر ناک،انا احموتوا، یوتے شنکو اور واز نیکی کے علاوہ برصغیر پاک و ہند میں " اکبرالہ آبادی، اقبال،فیض احمد فیض، حسرت، ساحر لدھیانوی،علی سردار جعفری، حبیب جالب، مجید امجد،شکیب جلالی،ظہیر کاشمیری، احمد مشتاق، جاوید انور،عبدالعزیز خالد،ابن انشا،یحیٰی امجد،کشور ناہید،مولانا ظفر علی خان،احمد ندیم قاسمی، یوسف ظفر،رئیس امروہی،شورش کاشمیری،ضمیر جعفری،احمد فراز،خاطر غزنوی،شہزاد احمد،نعیم صدیقی،طفیل ہوشیار پوری،امجد اسلام امجد اور افتخار عارف جیسے بیسیوں شعرا اور ادبا ہیں جنھوں نے نوآبادیاتی نظام کے پیش کردہ جبر و استحصال کے نظام کے خلاف مزاحمتی اور ردعمل کا ادب تخلیق کیا اور اپنی تخلیقات کے سبب معاشرے میں انقلاب، آزادی فکر اور حریت کے لیے آواز اٹھائی۔ چاہے جتنے بھی انقلاب آئے، صنعتی انقلاب، انقلاب روس، سپین، انقلاب ایران، انقلاب چین یا انقلاب فرانس وغیرہ نے ادب کو خاص شاعری کو ضرور متاثر کیا اور صنف شاعری میں نظم نے اپنے ہونے کا ثبوت دیا چاہے وہ کسی بھی زبان کا حصہ بنی۔ان انقلاقابات اور تحاریک آزادی نے اردو شاعری پر حد درجہ اثر ڈالا جو مختلف شعرا کے ہاں موجود ہے۔اردو کے نظم گو شعرا اس حوالے سے نمایاں ہیں جن کا ذکر اوپر گزر چکا، اسی اثر کو نمایاں طور پر سمجھنے کے لیے ان نظریات کی روشنی میں اردو نظم کا مطالعہ ضروری ہے۔ یہاں تحریک آزادی کشمیر سے منسلک شعرا کا تذکرہ از حد ضروری ہے جنھوں نے مسئلہ کشمیر کو دنیا میں اجاگر کرنے کے لیے اپنی شاعری کا سہارا لیا، ان میں محمد دین فوق، ملا طاہر غنی حبہ خاتون،عبدالاحد آزاد اور غلام احمد مہجور نمایاں طور پر تحریک آزادی کے سرخیل ہیں۔

نوآبادیاتی نظام کے پروردہ استحصالی نظام کے خلاف مزاحمت اور ردعمل کا جو بھی ادب

ان شعرا کے ہاں ہے چاہے وہ اپنی زباں میں ہے یا تراجم کی صورت میں، پس نوآبادیاتی اثرات کو واضح کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ ابھی تک دنیا اسی نظام کے تابع زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ نوآبادیاتی نظام کے تسلط کے ناقدین میں جن محققین اور نقادوں نے اپنی اپنی تصانیف دنیا کے سامنے پیش کیں اور نوآبادیاتی نظام اور اس کے موجودہ دور تک کے اثرات کا اظہار کیا ان میں سموئیل ہٹنگٹن پی، فرانز فینن، ایڈورڈ سعید، ہومی کے بھابھا، شمیم حنفی اور ڈاکٹر ناصر عباس نیر وغیرہ شامل ہیں۔ ان ناقدین نے اپنی تنقید کے سبب نوآبادیاتی نظام خاص یورپی سامراجی نظام کا مکروہ چہرہ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اور اس نظام کے تحت تخلیق پانے والے ادب اور شناختی بحران کو بھی ایک الگ انداز میں سمجھنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ ضرورت اس امر کی کہ اردو زبان وادب 'جو اسی نوآبادیاتی نظام کا ساختشانہ ہے' پر اس نظام کے اثرات کو سمجھا جائے اور تحقیقی وتنقیدی سانچے سے گزار کر حقیقت کا ادراک کیا جائے تاکہ شناخت اور شناختی بحران کا ازالہ ہو سکے اور انسانیت اپنی شناخت قائم کر کے اس استحصالی نظام سے چھٹکارا پا سکے۔ اس کامیابی کو حاصل کرنے کے لیے سب سے اہم کردار ادب کا ہے اور ادب میں شاعری خاص نظم ہمیشہ نمایاں رہے ہیں اور رہوں گے۔

اس ساری صورتِ حال کو پیدا کرنے کے لیے جو تاثر بنیادی حیثیت رکھتا ہے وہ یہ کہ نوآبادیاتی نظام مقامی لوگوں کی پس ماندگی دور کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہی تاثر نوآبادکار کے مقتدر کلامیے کی بنیاد ہے۔ اسی کلامیے کے سبب مفتوح قوم کا زاویہ فکر تبدیل کیا جاتا ہے اور اس کی جادوئی تاثیر کے سبب قابض لوگ خود کو برتر اور مغلوب قوم کی اقدار اور روایات کو کم تر اور حقیر گرداننے لگتے ہیں۔ برطانوی نوآبادیات کی تاریخ بھی اسی مقتدر بیانیے کی مثال واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ اسی بیانیے کو بنیاد بنا کر برطانیہ نے جدید نظامِ خیال کی تشکیل کی اور بتدریج دنیا کے مختلف ممالک کے تجارتی امور اور معیشت پر قبضہ کیا اور مقامی آبادی کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترویج کا جھانسہ دے کر محض مقامی روایات کے حصار میں قید رکھا۔ اس کے برعکس مقامی افراد نے جب مقتدر بیانیے کے ردِعمل میں اپنے فکر وعمل کو جدید خطوط پر استوار کیا تو نظریاتی

سطح پر قومیت پرستی، مزاحمت، احتجاج، تہذیبی آویزش وآمیزش اور منقسم شعور جیسے رجحانات سامنے آئے۔ یہ رجحانات اردو ادب کی من جملہ اصناف میں سے خاص صنفِ شاعری ''اردو نظم'' میں وسیع پیمانے پر تخلیقی سرمائے کا حصہ ہیں اور یہی پس نوآبادیات اثر ہے۔ اردو زبان وادب کی تنقید کی تفہیم اور فروغ میں گوپی چند نارنگ، ابوالکلام قاسمی، قاضی افضال حسین، وہاب اشرفی، شافع قدوائی، ڈاکٹر وزیر آغا، قمر جمیل، فہیم اعظمی، ضمیر بدایونی، اور ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے نام قابل تحسین اور قابل داد ہیں۔

☆☆☆

<u>حوالہ جات:</u>

۱۔ مبارک علی، ''تاریخ اور ریاست''، مضمون: امپیریئل ازم کیا ہے، فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء، ص ۷۵

2.www.goggle.com/UrduEnglishDictionary/Colonialism.

3.Same

۴۔ فیروز اللغات، اردو، جامع، ایڈیشن ۲۰۰۵ء، ص ۱۴۴۹

۵۔ ایضاً

۶۔ نیر، ناصر عباس، ڈاکٹر، "نوآبادیاتی صورت حال"، مشمولہ: ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور زبان و ادب، مرتبہ: ڈاکٹر ضیاء الحسن، لاہور، کلیہ علوم شرقیہ، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹیل کالج، ص ۶۴ تا ۶۵

7. Walter Laquer, "A dictionary of Politics" weiden field and Nicolson, London, P105.

۸۔ فرہنگ اصطلاحات، جلد اول (اے تا ڈی) لاہور، اردو سائنس بورڈ، ۱۹۸۴ء

۹۔ مبارک علی، ڈاکٹر، "برطانوی ہندوستان"، لاہور، سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۱۰ تا ۱۱

10. Young, J.C : Post - Colonialism, A very short introduction , p.129

11. Francis Maspero, Toward the African revolution, (Frantz Fanon) , New York, Grove Press, 1994, P.7

۱۲۔فینن فرانز"افتادگان خاک" مترجم: محمد پرویز، سجاد باقر رضوی، لاہور، نگارشات، مارچ ۱۹۴۹ء،ص۵۰

۱۳۔ایضاً،ص۶

۱۴۔ایضاً،ص۱۰۵

۱۵۔ایضاً،ص۲۰

۱۶۔ایضاً،ص۱۸۵

رفیعی اجمیری: ایک جواں مرگ افسانہ نگار

چھوٹو لال
اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ گرلز کالج
پیپلو، ٹونک، راجستھان۔304801
Mob: 9829827798

اردو افسانے کی ترویج وترقی میں اجمیر (راجستھان) کے افسانہ نگاروں کا بھی اہم رول رہا ہے۔ یہاں بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اردو فسانہ نگاری اپنے شباب پر تھی۔ ایک طرف انگریزی افسانوں کے ترجمہ شائع ہو رہے تھے تو دوسری طرف طبع زاد افسانے بھی تخلیق کیے جا رہے تھے۔ راجستھان کے تناظر میں اجمیر ہی وہ صوبہ تھا جہاں سب سے پہلے اردو افسانہ نگاری کی جانب توجہ مبذول کی گئی۔ ابتدائی دور میں یعنی بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں یہاں جو افسانہ نگار موجود تھے ان میں حیدر اجمیری، رفیعی اجمیری، قیسی رامپوری، محمود الحسن بہار کوٹی، عبیداللہ قدسی، عرفان فضائی، معین زلفی وغیرہ کے نام خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ''راجپوتانہ میں اردو اصنافِ ادب میں لکھا ہے کہ،

> ''راجستھان میں افسانہ نگاری صحیح معنوں میں ۱۹۲۲ء سے ملتی ہے۔ جب راجستھان میں بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں با قاعدہ افسانے لکھے جا نے لگے تھے۔ راقم نے حیدر اجمیری کے دو افسانے تلاش کئے ہیں جو

۱۹۲۲ء میں رسالہ ہزار داستان لاہور میں شائع ہوئے تھے۔ جن کے نام روزا اور شمع دان، ہیں۔ یہ دونوں افسانے ابھی تک کی تحقیق کے مطابق راجستھان کے مطبوعہ قدیم افسانے ہیں۔ پروفیسر فیروز احمد صاحب نے ۱۹۲۵ء تک کے افسانوں کا ذکر اپنے مضمون ''آزادی سے قبل راجستھان میں اردو افسانہ'' (۲۰۱۲ء) میں کیا ہے۔ حیدر اجمیری کے بعد رفیعی اجمیری، قیسی رامپوری، ابوالعرفان فضائی، الیاس رضوی اجمیری، معین زلفی (سبھی اجمیر) کے نام بتدریج لئے جا سکتے ہیں۔ جودھپور میں عظیم بیگ، جے پور میں شہاب برنی، ستار جے پوری، مختار الرحمٰن راہی اور ممتاز شکیب، شانتا بالی، ایسے نام ہیں جنھوں نے ملکی سطح پر افسانوی ادب میں نام کمایا۔ ان کے علاوہ حامد رشید ٹونکی، حبیب کیفی، نذیر فتح پوری وغیرہ راجستھان کے افسانوی ادب میں معزز اور معتبر نام ہیں۔''[۱]

رفیعی اجمیری (1909-1939): اپنے معاصرین افسانہ نگاروں میں ایک ممتاز شخصیت کے حامل تھے۔ رفیعی اجمیری جن کا اصل نام 'رفیع الدین صدیقی' تھا، کے حالات زندگی صرف ایک ہی جگہ نظر آتے ہیں، وہیں سے چند سطور نقل کرنا چاہوں گا۔

''رفیعی اجمیری جن کا اصل نام رفیع الدین صدیقی تھا، ۱۹۰۹ء میں اجمیر میں پیدا ہوئے۔ اور عین عالمِ شباب میں ۱۹۳۹ء میں انتقال کر گئے۔ والد کا نام شیخ سلام الدین تھا۔ اجمیر کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ بچپن سے ہی بہت ذہین تھے۔ مطالعہ کا شوق بہت تھا۔ اردو عربی فارسی انگریزی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ جب انھوں نے جولائی ۱۹۲۷ء میں رسالہ ''کیف'' جاری کیا تو ان کے برادران نے اس کی سخت مخالفت کی

تھی،جس کی وجہ سے رفیعی نے فضائی اجمیری اور قیسی رامپوری کو اس کی ذمہ داری سونپ دی تھی۔صرف تیس سال کی زندگی میں انھوں نے ملک گیر پیانے پر نہ صرف شہرت حال کی بلکہ اپنی تخلیقات کے ذریعہ مشاہیر ادب کو اپنا گرویدہ بنالیا۔اختر شیرانی،ان کے یار غار تھے،مجنوں گورکھپوری،نیاز فتح پوری،غلام رسول مہر،ساغر نظامی جیسی مشہور ادبی شخصیات سے ان کے تعلقات رہے۔انھوں نے طبع زاد افسانے بھی لکھے،انگریزی ادب سے ترجمہ بھی کئے،اور انگریزی ناولوں کا ترجمہ بھی کیا۔''[۲]

حضرت نیاز فتح پوری نے رفیعی اجمیری کے لیے لکھا تھا،

''حضرت رفیعی اجمیری،اجمیر کے ایک ایسے معزز و بارسوخ خاندان سے متعلق ہیں جس کے افراد قدیم کی داستان تاریخ ہند میں ''زکاشی تابہ کاشان نیم گام ست'' کی داستان ہے۔لیکن یہ خود اس کے دورِ انحطاط کی یادگار ہیں اور اس لئے بجائے سیف کے صرف قلم کے مالک ہیں۔''[۳]

اسی طرح ساغر نظامی نے ایک بار لکھا تھا،

''رفیعی ایک جوہرِ قابل تھا،جسے موت نے ہم سے چھین لیا۔اس کے خطوط میں اس کا اسلوب صاف جھلک رہا ہے۔یہ اسلوب جو ابوالکلام اور نیاز سے متاثر ہونے کا نتیجہ سہی لیکن خود بھی انفرادیت رکھتا ہے۔رفیعی ایک بلند اور نازک حس کا مالک تھا۔اس کے قلم میں رومانی ادب کی تخلیقی قوتیں تھیں۔اگر وہ زندہ رہتا تو اردو ادب میں ایک بڑی شخصیت مصدّق ہو جاتی۔''[۴]

رفیعی اجمیری،ترقی پسند تحریک سے پہلے کے افسانہ نگار ہیں۔ان کی افسانہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے محمود الحسن بہارکوٹی لکھتے ہیں۔

''اس دور میں سب سے پہلے ہماری نظر رفیعی اجمیری مرحوم پر پڑتی ہے، یہ تیسرے دور کا پہلا افسانہ نگار بھی اب تک پہلے دور کے رنگ سے متاثر تھا۔ ان کے تمام ابتدائی افسانے نیاز اور، ل، احمد کے رنگ کے مماثل ہیں لیکن آگے چل کر رفیعی نے اپنا جدا رنگ پیدا کرلیا جو صرف انہیں کے لئے مختص ہو کر رہ گیا تھا۔ حلاوت بیان اسلوب نگارش اور ہلکے مزاج کی چاشنی رفیعی کے افسانوں کی جان ہیں۔ ان کے افسانوں میں زندگی ہے اور ایسی اُپج جو مستقبل کے یلغار میں بھی ماند نہ پڑے گی۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں تخلیقی مواد بھی پیش کیا ہے اور یہ مواد ان کے آخری زمانے کے بہترین افسانوں ''محبت کا بلاوا'' ''حسن مصلی'' اور ''پتنگ کی جنگ'' میں ملتا ہے۔ ان افسانوں میں پہلی بار اصل حقیقت نگاری کی طرف ان کا قلم مڑا ہے۔''۵؎

رفیعی اجمیری کے افسانوی مجموعہ ''کہکشاں'' کے تعلق سے ڈاکٹر جمالی نے لکھا ہے،

''آپ کا افسانوی مجموعہ ''کہکشاں'' کے عنوان سے ۱۹۴۳ء میں ساقی بک ڈپو دہلی سے شائع ہوا تھا۔ جس میں ان کے تیس افسانے اور چار مضامین بھی شامل ہیں۔ راقم الحروف کے پیش نظر ''کہکشاں'' کا جو ایڈیشن ہے، اس پر سنہ اور مطبع کا نام نہیں ہے، لیکن شاہد احمد دہلوی، مدیر ساقی نے، ساقی بک ڈپو دہلی سے اس کو شائع کروایا تھا، اس کے اشتہار بھی انھوں نے اپنے رسالے میں دئے تھے۔ میرے پاس جو ''کہکشاں'' ہے اس پر رفیعی اجمیری مرحوم لکھا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ اس میں تیس افسانے اور چار ادبی مضامین شامل ہیں ان کے عنوانات حسب ذیل ہیں،

وقفہ۔ بدگمانی۔ جاہل۔ ایک خطرناک غلطی، جرمِ تغافل، روشن آرا باغ

میں ایک دن۔کارنمایاں۔خدمتِ قوم۔بے غرض خودغرضی۔رات اور زلف کا افسانہ۔سوئے مےخانہ آمدِ پیرما۔داستانِ بلاکشاں نہ سنو۔اگرتم اس سے محبت کرتے ہوتو کہ دو۔محبت کا بلاوا۔حسنِ مصطفٰے۔مٹھائی۔ظریف کی بے چین روح (ڈرامہ) گھوسن کی لڑکی۔موہن۔دامِ فریب۔بچوں کی تعلیم۔جب نیند ترجمان ہو۔عورت کی نفسیات۔نہ تنہا عشق از دیدار خیزد۔عشق ازیں بسیار کرد است و کند۔دین الٰہی۔پتنگ کی جنگ۔سڑکی حکیم۔مراق۔''[6]

رفیعی اجمیری کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے،ان کے ہم عصر قیسی رامپوری نے لکھا تھا،

''رفیعی نہایت ہی خوش فکر اور بڑے ہی ذہین تھے۔نظم ونثر،تحریر وتقریر سب کے بادشاہ تھے۔جیسی بے نظیر تحریر تھی ایسی ہی دلکش تقریر تھی۔سامعین کو بالعموم خاموش ہی پایا ہے مگر یہ بلبل ہزار داستان جب چہکتا تو سحر گفتگو سے محفل مسحور ہو جاتی تھی۔اس میں کچھ مبالغہ نہیں کر رہا ہوں جو لوگ مرحوم کی پرائیوٹ مجالس میں رہے ہیں وہ اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔میں نے بڑے بڑے قابلوں کو اس سحر گفتار نوجوان کے مقابلہ میں گنگ پایا ہے۔طبیعت میں شوخی وشرارت بھی بے حد تھی۔اور زندہ دلی،خوش مزاجی اور شگفتہ گوئی کا تو یہ عالم تھا کہ بہت سے لوگ مرحوم کے پاس محض آتے ہی خوش وقتی کے لئے تھے۔نیاؔز صاحب سے مرحوم کی خوبیاں پوچھئے وہ بھی ان کے مداحین میں سے ہیں۔حافظہ اس قدر قوی تھا کہ پیش پا افتادہ وقابل فراموش باتوں سے لے کر دنیا کے اہم ترین امور تک یاد داشت میں محفوظ تھے۔ہر موضوع پر بول سکتے تھے۔کمال کے ساتھ۔فطرتاً رجائی واقع ہوئے تھے۔ٹریجڈی اور قنوطیت سے سخت متنفر تھے۔''[7]

پروفیسر فیروز احمد رفیعی اجمیری کی افسانہ نگاری کے تعلق سے لکھتے ہیں،

''رفیعی اجمیری ان افسانہ نگاروں میں نہیں تھے جن کے ہاتھ میں تبلیغی نصاب تھا۔یا جو اپنے مفید خیالات سے معاشرتی زندگی میں انقلابی تبدیلیوں کے خوگر تھے۔ان کے یہاں سماجی اور عمرانی مسائل سے عمداً چشم پوشی کا اظہار ہوتا ہے۔وہ نہ سیاست میں الجھتے ہیں اور نہ ہی اخلاقیات میں ۔وہ ایک عاشق ہیں جو اگر میدان غزل میں سرگرم عمل ہوتا تو اپنی شدید انفرادیت سے ایک کارنامہ انجام دیتا۔مگر غزل کے اشعار کی ریزہ خیالی کی طرح ان کے افسانوں کے موضوعاتی سطح کا تعلق بھی روایتی غزل کے اسی غالب موضوع سے ہے جو عرف عام میں عشق کہلاتا ہے۔اس عشق کے ہزار رنگ ہیں اور ہر رنگ جن کیفیات کا مظہر ہوتا ہے،رفیعی کے افسانے ان ہی کیفیات کے ترجمان ہیں۔مثلاً ان کا افسانہ''عورت کی نفسیات''،صرف اس بنیادی مسئلہ کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ہے کہ محبت کے لئے جبر ضروری ہے یا نہیں۔''۸

''رفیعی کے افسانوں کا عام مزاج حسن وعشق کے ان ہی فلسفیانہ نکات کا ترجمان ہے ۔وہ میاں بیوی کے آپسی رشتے ہوں یا عنفوان شباب کی سرحدوں کو چھوتے ہوئے نوجوان دلوں کے دہکتے ہوئے جذبات،رفیعی کی نظر ان سب پر محیط ہے۔اس لئے ان کے افسانے زندگی اور سماج کو درپیش مسائل کا نہ کوئی حل پیش کرتے ہیں اور نہ ہی انھیں ان سے کوئی دلچسپی ہے۔وہ سرتاپا رومانوی ہیں اور یہی رومان ان کے رگ وپے میں سرائیت کئے ہوئے ہے۔اس کا مزید ان کے افسانوں کی زبان سے بھی فراہم ہوتا ہے۔جس طرح ان کے کردار زرق برق لباس میں ملبوس نظر

آتے ہیں،اسی طرح تشبیہات و استعارات نیز تراکیب سے بھی ان کی زبان ہے۔''۹

رفیعی اجمیری نے افسانوی ادب میں ملک گیر پیمانے پرشہرت حاصل کی تھی۔لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ راجستھان کے ہی لوگوں نے ان کواوران کی افسانہ نگاری کو بھلا دیا۔نہ تو پرکوئی تحقیقی کام ہوااور نہ ہی راجستھان کے تحقیقی مقالوں میں ان کوجگہ دی گئی۔آج ضرورت ہے کہ رفیعی اجمیری جیسے عظیم افسانہ نگار کی خدمات کومکمل طور پر منظر عام پرلایا جائے۔اور یہ خوش آئند بات ہے کہ دیر سے ہی سہی ڈاکٹر جمالی نے رفیعی اجمیری کی حیات اوران کی افسانہ نگاری پرایک ضخیم مستقل کتاب ''رفیعی اجمیری اوران کی افسانہ نگاری'' کے عنوان سے شائع کی ہے۔بلاشبہ یہ کتاب ''رفیعی شناسی'' کے لیے ایک مستند ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔رفیعی اجمیری کا شمار راجستھان کے اولین افسانہ نگاروں میں تو شمار ہوتا ہی ہے ساتھ ہی اردو افسانے کوراجستھان میں مقبول بنانے میں بھی انھوں نے اہم کردارادا کیا تھا۔

☆☆☆

ماخذ۔

۱۔راجپوتانہ میں اردو اصناف ادب:ایک جائزہ۔ڈاکٹر شاہد احمد جمالی۔راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی، جے پور۔۲۰۲۱ء۔ص،۱۷۵

۲۔رفیعی اجمیری اوران کی افسانہ نگاری۔راجپوتانہ اردوریسرچ اکیڈمی، جے پور۔۲۰۲۰۔ص۔۲۰

۳۔چنددن لکھنو سے باہر،نیاز فتح پوری کا مضمون،نگار،فروری،۱۹۳۰ء۔لکھنو،ص۔۷۷

۴۔ماہنامہ ایشیا۔میرٹھ(ساغرنظامی)۔جنوری،۱۹۴۲ء

۵۔محمود الحسن بہار کوٹی...ایک تعارف۔شاہد جمالی۔راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی، جے پور، ۲۰۱۹۔ص۔۷۶

۶۔رفیعی اجمیری اوران کی افسانہ نگاری۔ڈاکٹر شاہد احمد جمالی۔راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی، جے پور۔۲۰۲۰ء۔ص۔۳۱۔۳۲
۷۔ماہنامہ ساقی۔دہلی۔شاہد احمد دہلوی۔مئی۔۱۹۴۱ء۔
۸۔راجستھان میں اردو، ڈاکٹر فیروز احمد، براؤن بک پبلشرز، دہلی۔۲۰۱۳ء۔ص،۴۷۸
۹۔راجستھان میں اردو، ص،۴۸۰

مختار ٹونکی: بحیثیت طنز و مزاح نگار

ریسرچ اسکالر:
سلطانہ فاطمہ انصاری،
کوٹہ یونیورسٹی،
کوٹہ، راجستھان

نگراں:
ڈاکٹر نادرہ خاتون
لیکچرار اردو، گرمنٹ آرٹس گرلس
کالج کوٹہ، راجستھان

ملخص

اردو ادب میں ابتداء ہی سے طنز مزاح کے نقوش ملتے ہیں۔ اس کے ابتدائی نقوش ہم کو داستانوں، اودھ پنچ اخبار اور غالب کے خطوط میں ملتے ہیں۔ بعد ازاں طنز و مزاح نگاری کا وسعت عطا کرنے میں احمد شاہ پطرس بخاری، عظیم بیگ چغتائی، رشید احمد صدیقی فکر تونسوی، کنہیالال لپور، کرشن چند، مجتبیٰ حسین، مشتاق احمد یوسفی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

موجودہ دور میں طنز و مزاح کی اس روایت کے امین بن کر مختار ٹونکی دنیائے ادب میں اس کی بقا اور تسلسل کے لیے کوشاں ہیں جن کا تعلق بھی ٹونک ہی سے ہے۔ اس صنف میں انھوں نے اعلیٰ ترین اور بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔

مختار ٹونکی کی پہچان ایک طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے ہے۔ جس طرح ان سے قبل مشتاق احمد یوسفی نے اپنے مزاحیہ مضامین کے ذریعہ دنیائے ادب میں عالمی سطح پر ایک مقام حاصل کیا ہے اور قبولیت عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ بنائی ہے۔ اسی طرح سے مختار ٹونکی نے بھی اپنے صلاحیت کے ذریعہ طنز و مزاح نگاری کے میدان میں اپنا ایک مقام پیدا کیا ہے۔ انھوں نے سماج کے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا اور طنز و مزاح کے تیر چلائے ہیں۔ انھوں نے عہد جدید کے فکری تقاضوں اور جد جہد کو اپنے ذاتی تجربات، مشاہدات اور احساسات کو سامنے رکھ کر پیش کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں کلاسیکی رنگ بکھرا پڑا ہے۔ اسی لیے وہ اس کے اظہار کے لیے بیانیہ اسلوب کے ساتھ سادہ اور عام فہم زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ منتخب مواد اور موضوع لے کر اس کے واقعات کا

بیان بڑے ہی دلچسپ انداز میں کرتے ہیں۔

انسانی زندگی میں خوشی اورغم دونوں پہلونمایاں طور پر شامل ہوتے ہیں۔مگر انسان غموں پر خوشی کا ترجیح دیتا ہے۔کیونکہ غم واضطراب کی کیفیت انسان کے اندر الجھن اور نا آسودگی پیدا کرتی ہے وہیں مسرت بھرے لمحے اور ہلکی سی مسکراہٹ سے انسان غم بھول جاتا ہے۔اسی لیے انسان کی زندگی میں مسرت اور خوشی کی بڑی اہمیت ہے۔ مزاح ایک فطری احساس ہے جو کہ مسرت اور خوشی کے احساسات پر منحصر ہوتا ہے۔وہیں شدید طنز کی کیفیت بھی انسانی مزاج کا احاطہ کرتی ہے مگر ادب میں اگر خالص طنز ہو تو وہ بوجھل ہو جاتا ہے اور خالص مزاح بھی انسان کو اکتا دیتا ہے۔اگر ادب میں طنز کے ساتھ ساتھ مزاح کو بھی شامل کر دیا جائے تو اس کے قاری میں لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ اس پر غور وفکر کرنے کے بھی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

طنز ومزاح کی تاریخی حیثیت پر اگر غور کیا جائے تو اردو ادب میں ابتداء ہی سے طنز مزاح کے نقوش ملتے ہیں۔اس کے ابتدائی نقوش ہم کو داستانوں میں ملتے ہیں مگر ان کی عبارت مقفیٰ اور مسجع ہوتی تھی اس میں فقرہ بازی طعن وتشنیع زیادہ اور ظرافت کے نمونے کم ہی ملتے ہیں۔غالب کے خطوط اور اودھ پنچ اخبار نے طنز مزاح میں سادگی کا استعمال کر کے اس کو فروغ دیا۔بقول وزیر آغا:

> ''اودھ پنچ نہ صرف اردو کا پہلا طنز یہ اخبار تھا بلکہ اس نے اردو میں پہلی بار مغرب کے طنز ومزاح کے حربوں کا استعمال کیا دوسرے یہ کہ سیاسی اور مجلسی مسائل پر بھی بھر پور طنز کا آغاز اودھ پنچ سے ہی ہوتا ہے۔''

(اردو ادب میں طنز مزاح وزیر آغا ص۔۳۶۸)

طنز ومزاح نگاری کو وسعت عطا کرنے میں احمد شاہ پطرس بخاری،عظیم بیگ چغتائی،رشید احمد صدیقی فکر تونسوی،کنہیا لال کپور،کرشن چند،مجتبیٰ حسین،مشتاق احمد یوسفی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔مشتاق احمد یوسفی (جن کا بھی ٹونک سے تعلق تھا) نے طنز مزاح کو بین الاقوامی سطح پر شہرت عطا کی۔موجودہ دور میں طنز ومزاح کی اس روایت کے امین بن کر مختار ٹونکی دنیائے ادب میں اس کی بقا اور تسلسل کے لیے کوشاں ہیں جن کا تعلق بھی ٹونک ہی سے ہے۔اس صنف میں انھوں نے اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں جن کے لیے ان کے مجموعوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

مختار ٹونکی کے پانچ مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔جو کہ پوری طرح سے طنز ومزاح اور انشائیوں پر مشتمل ہیں۔بالفاظ دیگر وہ تمام طنشائیوں پر دلالت کرتے ہیں۔انھوں نے اپنے انشائیوں کو طنز ومزاح کے ساتھ ملا کر ایک نئی صنف ایجاد کی ہے اور وہ ہے طنشائیہ یعنی اپنے طنز کو انھوں نے انشائیے کی چاشنی میں لپیٹ کر دیا ہے تا کہ قاری کو گراں بھی نہ گزرے اور وہ اپنے مقصد میں بھی کامیاب ہو جائیں۔ان کے مجموعے مندرجہ ذیل ہے۔

اوٹ پٹانگ ۱۹۹۴ء،لغویات ۲۰۰۱ء،خرافات ۲۰۱۵ء،مزخرافات ۲۰۱۷ء،ہفوات ۲۰۲۰ قابل ذکر ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کے ہم وطن ہونے کے وجہ سے مختارٹونکی بھی طنزومزاح میں ان کے معتقد نظر آتے ہیں اس ہم وطنی اوراعتقاد کے ساتھ ساتھ دوسری خوبی مسعوداختر یہ بتاتے ہیں کہ

''دونوں ہی مزاح میں ہزل،تضحیک،تذلیل،پھکڑ بازی،رکیک،پوچ،فحش اورادق گوئی سے سخت پرہیز کرتے ہیں۔تیسری صفت ان کی یہ ہے کہ دونوں ہی شگفتہ طنز، خالص مزاح، فکاہت،تعریض،لطیفہ،ایجاز،رعایت لفظی،پیروڈی بذلہ سنجی،خاکہ، شوخ بیانی،کلکاری،کے ستھرے ذوق سے قاری کومسکرانے کی ہمت دیتے ہیں خزاں کے دور میں جومسکرا نہیں سکتے وہ لطف فصل بہاراں اٹھا نہیں سکتے''

(ماہنامہ شگوفے،مضمون مختارٹونکی جن کے سر ہے طنزومزاح کی کلاہ افتخار مسعوداختر ص ۴۵)

اس اقتباس سے مختارٹونکی کی طنزاورظرافت کے تعلق قدراور تعین کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے کس طرح فراخ دلی اورخوش اسلوبی کے ساتھ اپنی جادوبیانی کا ثبوت دیا ہے۔

طنزومزاح نگاری کو اگرچہ ادب میں دوسرے درجے کا ادب سمجھا جاتا ہے، پھر بھی اس کے اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے اس کا اندازہ ہم رونالڈ ناکس (Ronald knox) کے اس فقرے سے لگاسکتے ہیں کہ مزاح نگار خرگوش کی طرح بھاگتا ہے لیکن طنز نگار کتوں کے ساتھ شکار کھیلتا ہے۔

(اردوادب میں طنزومزاح،وزیرآغا،ص ۴۸)

اس بات کی وضاحت مختارٹونکی صاحب اپنے مجموعے ''اوٹ پٹانگ'' کے ابتدائیہ میں اس طرح کرتے ہیں کہ

''ہم نے دونوں میدانوں میں چھلانگ لگائی ہے یعنی رونالڈ ناکس کے مطابق خرگوش کے ساتھ بھاگے ہیں اور کتوں کے ساتھ شکار بھی کھیلا ہے اور وزیرآغا کے لفظوں میں ہردوطرح ہنسنے کی پریکٹس بھی کی ہے''

(اوٹ پٹانگ،ابتدائیہ،ص ۱۱)

مختارٹونکی کا مقصد صرف طنز کرنا ہی نہیں ہے بلکہ سماج میں پھیلی بے اعتدالیوں اور ناہمواریوں کو بھی ظاہر کرنا اوران کی اصلاح کرنا ہے۔ان کی نثر میں کاٹ کرنے کا مقصد انحطاط اورناسازگاری کا اختتام کرکے سماج میں خوشی وانبساط،محبت اورخلوص اورفرحت ومسرت کی فضاؤں کا غلبہ کرنا ہے۔ان کے مضمون ''اختلاف زندہ باد'' مذہب کے نام پرہونے والے اختلافات کی رنگارنگی کوظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:

''کہیں ہرہرمہادیو ہے تو کہیں گھنشیام ہے پھر دوچار نہیں، دس بیس نہیں۔خدانظر

بدسے بچائے پورے تینتیس (۳۳) کروڑ دیوی دیوتا ہیں۔شومئی قسمت یہ ایک ایک دیوتا بھی اکثریت کے حصے بخرے میں نہیں آتا ہے خورد ونوش اور لباس و پوشاک کو دیکھو کہ رسم و رواج کے آئینے میں جھانکو یہاں بھی اختلاف کی جھلکیاں ملیں گی کوئی گھاس پوس کھا رہا ہے تو کوئی روٹی بوٹی اڑا رہا ہے۔ادھر دال باٹی چورما ہے تو ادھر انڈا مچھلی قورمہ ہے۔اس کے علاوہ ایک دوسرے اقتباس میں بھی ان کی طرز اسلوب پر نگاہ ضروری ہے طرفہ یہ ہے کہ یہاں کی اقلیت بھی اختلاف کا شکار ہوگئی ہے۔بہتر (۷۲) فرقوں کا سجا ہوا بازار ہے۔شیعہ اور سنی میں جوتم پیزار ہے تو بریلوی، دیو بندی میں کشتم پچھاڑ ہے۔ارے یہ کون چلایا میں سنی ہوں۔ارے یہ کون ڈکارا میں جماعتی ہوں۔علماء کی اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ ہے گرچہ ان کے ہاتھ میں قوم کی ٹوٹی پھوٹی باگ ہے۔

(مضمون اختلاف زندہ باد،خرافات۔ص ٦٧)

مختار ٹونکی ایک طبیب کی مانند ہیں۔جو ہمارے معاشرے اور عوام میں موجود نفرت اور اختلاف کو درست کرنے کے لیے قلم کو نشتر بنا کر جراحی کا کام لیتے ہیں اور بیماری کا سدباب یوں بھی کیا جاتا ہے۔انھوں نے زندگی کا مطالعہ اپنے گہرے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں کیا ہے۔سماج کی تمام تر برائیوں، خامیوں اور کمزوریوں کو اپنی تحریر میں پرکھا اور برتا ہے۔انھوں نے اپنے موضوعات کا مواد سماج کے افراد کی زندگیوں سے اخذ کیا ہے۔ایک ادیب کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ہر دم چوکنا رہے اور وہ سماج کی اصلاح کا کام انجام دے سکے اور لوگوں میں وہ احساس پیدا کر سکے کہ وہ اپنی کمزوریوں کا علاج کر سکے۔

موصوف نے اپنی طنز و مزاح نگاری میں اپنے عہد کی صورت حال کا بھی بیان کیا ہے۔انھوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے زندگی کے معمولات اور واقعات کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا۔ہر ادیب اپنے عہد کا ترجمان ہوا کرتا ہے۔اور اس کی تحریر میں اس کے عہد کی جھلکیاں صاف طور پر نظر آتی ہیں جو اپنے عہد کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہیں۔

اسی طرح رشوت ہمارے سماج میں ایک گرگٹ کی طرح سے ہے جو ہر وقت اور ہر جگہ ہمارے سامنے الگ الگ رنگ روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔کہیں ڈونیشن کے نام پر تو کہیں کمیشن کے نام پر تو کہیں ایڈجسمنٹ کے نام پر رشوت لی جاتی ہے۔انھوں نے رشوت کے مختلف کے طریقوں کا جزیوں نکالا ہے۔"ر" سے روپیہ "ش" سے شکرانہ "و" سے وظیفہ اور "ت" سے تحفہ "ن" سے نذرانہ اس کی جیتی جاگتی مثالیں ہیں اس طرح کی مثالوں کے ساتھ رشوت کا دوسرا پہلو بھی دکھاتے ہیں کہ:

''اگر آپ کسی مندر میں قدم رکھتے ہیں یا کسی بزرگ کے مزار مقدس کی زیارت کریں تو آپ کو دوشیزۂ رشوت کا جمال دل افروز دیکھنے کو مل جائے گا بھگت جن اور عقیدت مند جو بھینٹ چڑھاتے ہیں وہ خالص دیسی گھی کی طرح خالص رشوت ہے، بھگوان کو بھوگ مفت میں نہیں دیا جاتا ہے اور پیر فقیر کی تربت پر کوئی چڑھاوا بغیر منت کے نہیں ہوتا ہے۔''

(مزخرافات۔مضمون رنگہائے رشوت۔ص ۱۷)

''پیٹ اور پلیٹ''میں انسانی زندگی کی مجبوریوں اور روزگار کے کھیل پر جو طنز کیا ہے وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ سماج کتنا پچھڑا ہوا ہے:۔

''یہ پیٹ ہی تو ہے جو تاشی کو بھی راشی بنا دیتا ہے اور نادار کو زردار کے قدموں میں ڈال دیتا ہے۔عورت اپنی حرمت وعصمت بیچتی ہے تو پیٹ کی خاطر۔۔۔۔آپ ہمیں بتائیں کہ لوگ قومی سطح پر بھکاری کیوں بنے ہوئے ہیں اور ہمیں سمجھائیں کہ کچھ لوگ بین الاقوامی سطح پر کھلاڑی کیوں بنے ہوئے ہیں۔یہ چیریٹی چندہ وندہ کیا ہے؟ سب پیٹ کا گورکھ دھندہ ہے۔یہ نذرانہ چڑھاوا کیا ہے۔پیٹ و پلیٹ کا بلاوہ ہے''۔

(پیٹ اور پلیٹ،مزخرفات،ص ۴۵)

مختار ٹونکی نے اپنے مجموعوں میں اردو ادب کے کینوس پر اپنے طنز کے تیر چلائے ہیں اور اردو ادب کی کساد بازاری کا بھی اپنے مضامین میں اچھوتے انداز سے تذکرہ کیا ہے۔مثلاً چلو فیکٹری میں ادب تخلیق کرنے کا ٹائم ہو گیا ہے۔

میں ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہوں لیکن دنیائے شاعری میں قد آور ہوں اور پورا مست قلندر ہوں۔ شہر شہر میں نعرہ ہے شریر بندر ہمارا ہے پروفیسری تو پیشہ ہے شاعری میں پیسہ ہے یونیورسٹی سے غائب رہتا ہوں مشاعروں میں حاضر رہتا اور چند شعر سنا تا ہوں ہزاروں روپے کما تا ہوں۔خوب وارے نیارے ہیں اور شاعری میں پو بارے ہیں،قطب شمالی پر ہو آیا ہوں وہاں بھی جھنڈے گاڑ آیا ہوں، مجھ سے اچھا کون ہے میرا جیسا کون ہے؟ میں میں میں''

(ادب برائے ڈبل روٹی۔لغویات۔ص ۱۰۷)

پطرس بخاری نے''کتے'' لکھ کر اردو ادب کو کتے سے روشناس کرایا تو مشتاق احمد یوسفی نے'' آب گم'' سبز مانا ہری اور مزہ میں کتے کی مختصر سی سوانح عمری بیان کی ہے۔مختصر یہ کہ اردو ادب میں کتے پر کئی ادیبوں نے لکھا

ہے موصوف نے بھی اپنے مجموعے لغویات میں بھی ''دوپیروں کے کتے'' لکھ کر اشرف المخلوقات اور کتوں کا موازنہ کیا ہے۔

''آج دوپیروں کے کتوں کا دور دورہ ہے ان کی پرورش اور پرداخت کے لیے سرکار نے جگہ جگہ ڈاگ ڈپارٹمنٹ کھول رکھے ہیں ۔۔۔۔ قدرت نے تو پالتو کتے پیدا کئے لیکن حکومت نے فالتو کتوں کی بھی فوج کھڑی کردی ہے۔''

(دوپہر کے کتے۔لغویات۔ص۴)

مختارؔ ٹونکی نے اپنی تحریروں میں پیروڈی اور تحریف نگاری سے بھی استفادہ کیا ہے۔ جو دلچسپی سے بھرپور ہونے کے ساتھ مزاحیہ پہلوؤں میں اپنی بات کے واضح کرنے کے لیے بھی اضافہ کرتے ہیں۔جس کو پڑھ کر قاری بغیر مسکرائے نہیں رہ سکتا ہے۔اس ضمن میں درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

ہزاروں سال آٹا اپنی بے قدری پہ روتا ہے بڑی مشکل سے پایا ہے توے روٹی بن رتبہ

نان ہے تو جہان ہے پیارے

صرف مرغی پہ منحصر نہیں غالبؔ بیضہ مخصوص سب کا ہی مدور ہے

ڈھونڈوگے ہمیں کونوں کونوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

یہ ان کی خوبی ہے کہ وہ بے تکی باتوں میں بھی تک پیدا کر کے قاری کی توجہ اپنی طرف کر لیتے ہیں۔ جہاں پر وہ الفاظ کے الٹ پھیر سے مزاح پیدا کرتے ہیں وہیں پر وہ عربی وفارسی کے الفاظ،مثالیں اور محاوروں کے استعمال سے اپنی تخلیقات میں حسن پیدا کرتے ہیں۔موصوف اپنے مضامین کے عنوانات میں بھی اسی طرح کی تبدیلی سے مزاحیہ عنصر پیدا کرتے ہیں۔مثال کے طور پر:

حی علی الفلاح ۔ حی علی المزاح (مزاحیہ)

دریں چہ شک بلکہ سو بار دریں چہ شک

ٹی۔وی بنام بیوی،خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہیں

ماڈرن قصائی،خدا کی پریشانی،دوپہر کے کتّے،مویشیائی ادب

پاپائے اردو،نیکر راج،ٹرک چھاپ شاعرے،پڑوار دوکھودو گھاس

مختارؔ ٹونکی نے خاکے کے فن میں اپنی مہارت دکھائی ہے۔ان کے مزاحیہ فن پارہ میں خاکوں کی جھلک نظر آتی ہے۔مگر انھوں نے کم ہی خاکے لکھے ہیں۔اپنے پہلے مجموعے''اوٹ پٹانگ''میں انھوں نے اپنے ایک دوست کا خاکہ لکھا تھا مگر اس مزاح کو نہ سمجھ سکے اور ان سے ناراض ہوگئے۔مختار صاحب نے اس کا نام بدل کر اپنے

مجموعے میں پیش کیا۔انھوں نے اپنے مجموعے میں’’گل پوشی خزاں رسیدہ گلزار کی‘‘ کے عنوان پر شگفتہ انداز میں قلم اٹھایا ہے۔ان کے ایک خاکہ کا اقتباس درج ذیل ہے:

’’یہ جغرافیہ کی بات بھی آپ نے خوب کہی۔کسی زمانے میں ان کے حلیہ شریف پر جغرافیہ کی اصطلاح فٹ بیٹھی ہوگی۔اب تو وہ جغرافیہ اور آثار قدیمہ میں گڈ مڈ ہوکر رہ گئے ہیں دیکھو تو زمانے کے سرد و گرم چشیدہ اور گرگ باراں دیدہ نظر آتے ہیں قریب جاؤ تو مرد میزار اور خزاں رسیدہ بہار معلوم ہوتے ہیں۔نہ عوج بن عوق طرح لمبے تڑنگے اور نہ ہی ازمنہ قدیم کے بونوں کی طرح کوتاہ جسم اور پستہ قد۔گورے چٹے بھی نہیں ہیں کہ جو دیکھے فریفتہ ہوجائے اور اتنے کالے کلوٹے بھی نہیں کہ افریقہ کے حبشیوں کی یاد آئے۔سانولے سلونے گل محمد کے بیٹے گلزار احمد خان کامن ناؤن کی طرح سے بس ایک واجبی واجبی سے انسان ہیں۔

(اوٹ پٹانگ گل پوشی خزاں رسیدہ گلزار کی،ص۔۹۹۔۱۰۰)

اسی طرح سے انھوں نے ایک مضمون’خرافات‘ میں’’مولانا راکٹ‘‘ کے عنوان سے لکھا ہے۔جس میں خاکہ کی جھلک نظر آتی ہے۔اشارے کنائے میں انھوں نے کسی شخص کے اوصاف مولانا راکٹ کے نام سے تحریر کیے ہیں:۔

’’مولانا راکٹ ویسے تو واقعی مولانا ہیں فارغ التحصیل،سند یافتہ،شرعی پجامہ ہولڈر اور باقاعدہ ڈاڑھی دار امور شرعی اور مذہبی مسائل سے خبردار پہلی بار اگر کوئی ان سے مشرف بہ دیدار ہو تو کہہ نہیں سکتا کہ وہ کوئی مضحکہ خیز قسم کے آدمی ہیں۔بس ہر کام میں ان کی چیتے جیسی پھرتی آدمی کو چونکاتی ہے۔وہ اتنی تیزی سے اٹھک بیٹھک اور چلت پھرت کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ گمان ہوتا ہے کہ کوئی کٹھ پتلی کسی کی انگلیوں کے اشارے پر ناچ رہی ہے۔‘‘

(خرافات مولانا راکٹ۔ص۔۱۹۱)

مختصر طور پر یہ کہ مختار ٹونکی اردو ادب میں طنز و مزاح نگاری میں بلند مقام رکھتے ہیں۔وہ انسانی نفسیات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ان کا عمیق و وسیع مطالعہ ان کے فن کارانہ مہارت کو ظاہر کرتا ہے۔ان کے مضامین طنز کا تیکھا پن نہیں ہے نہ ہی لہجے میں تلخی کا احساس ہوتا ہے۔وہ ہلکے پھلکے انداز میں مزاح پیدا کرنے میں ماہر ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر ترنم ریاض: شخصیت اور شاعری

ریسرچ اسکالر:
رائلہ فاطمہ انصاری
یونیورسٹی آف کوٹہ، کوٹہ،
راجستھان

نگراں:
ڈاکٹر حسن آرا
گورنمنٹ آرٹ کالج، کوٹہ،
راجستھان

ملخص

دنیا کے ہر ملک اور ہر حصے میں خواتین نے اردو شعر وادب میں اپنی قلم سے جو ہر دکھائے ہیں، شاعری کے میدان میں بھی خواتین ایک عرصے سے اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہی ہیں۔ بیسوی صدی کے بعد سے ہی خاتون شاعرات کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ اب جس کثرت سے ادب میں کلام شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں ایک بڑا حصہ خاتون کی تخلیقات کا بھی ہوتا ہے۔

بیسوی صدی کی آٹھویں دہائی میں اردو ادب کی خاتون شاعرات میں ڈاکٹر ترنم ریاض کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ ترنم ریاض جدید دور کی اہم شاعرہ اور ادیبہ ہیں۔ وہ ایک کامیاب افسانہ نگار، تنقید و تحقیق نگار، شاعرہ، ترجمہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ ترنم ریاض ۹/ اگست ۱۹۶۳ء کو سری نگر کشمیر میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد چودھری محمد اختر خان اور والدہ ثریا خان ہے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے اردو اور ایجوکیشن میں ایم۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد

ایم۔ایڈ۔کی ڈگری لی۔اس کے علاوہ کشمیر یونیورسٹی سے ایجوکیشن میں پی۔ایچ۔ڈی۔کی ڈگری بھی حاصل کی۔انہوں نے تقریباً بیس سے بھی زیادہ کتابیں تخلیق کی ہیں اور ان کی تخلیقات ہندوستان اور بیرونی ممالک کی متعدد یونیورسٹیوں میں موضوع بحث رہی ہیں۔

....

ادب کی دنیا میں اردو زبان وادب کو ممتاز مقام حاصل ہے اور یہ مقام دلانے میں اردو شاعری کو سب سے بڑا اشرف حاصل ہے۔اردو شاعری اس گلدستے کی مانند ہے۔جس کے تمام پھولوں میں غزل کا ساترنم،نظم کی سی موسیقی،دیگر اصناف کی سی تازگی اور ان سب کی خوشبو سموئی ہوئی ہے۔اردو شاعری کا انداز بیان ہمیشہ سے ہی دل کو لبھانے والا رہا ہے۔اردو ادب میں شاعری کو کافی مقبولیت حاصل ہے۔ان میں حسن ومحبت کی شاعری ہو یا غم کی،زندگی اور انسانیت کا حوالہ ہو یا پھر دنیا کی بے ثباتی کا ذکر غرض کہ تمام تر پہلوؤں پر اردو شعراء نے اپنے کلام سے اردو شعروادب کو مہکایا ہے۔ان میں خاتون شاعرات بھی شامل ہیں۔

دنیا کے ہر ملک اور ہر حصے میں خواتین نے اردو شعروادب میں اپنی قلم سے جو ہر دکھائے ہیں،شاعری کے میدان میں بھی خواتین ایک عرصے سے اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہی ہیں۔بیسوی صدی کے بعد سے ہی خاتون شاعرات کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا ہے۔اب جس کثرت سے ادب میں کلام شائع ہوتے رہتے ہیں۔ان میں ایک بڑا حصہ خاتون کی تخلیقات کا بھی ہوتا ہے۔

بیسوی صدی کی آٹھویں دہائی میں اردو ادب کی خاتون شاعرات میں ڈاکٹر ترنم ریاض کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ترنم ریاض جدید دور کی اہم شاعرہ اور ادیبہ ہیں۔وہ ایک کامیاب افسانہ نگار،تنقید وتحقیق نگار،شاعرہ،ترجمہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ترنم ریاض ۹/اگست ۱۹۶۳ء کو سری نگر کشمیر میں پیدا ہوئیں۔ان کے والد چودھری محمد اختر خان اور والدہ ثریا خان ہے۔ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے اردو اور ایجوکیشن میں ایم۔اے۔کی ڈگری حاصل کی۔اس کے بعد ایم۔

ایڈ۔ کی ڈگری لی۔ اس کے علاوہ کشمیر یونیورسٹی سے ایجوکیشن میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری بھی حاصل کی۔ انہوں نے تقریباً بیس سے بھی زیادہ کتابیں تخلیق کی ہیں اور ان کی تخلیقات ہندوستان اور بیرونی ممالک کی متعدد یونیورسٹیوں میں موضوع بحث رہی ہیں۔

ڈاکٹر ترنم ریاض کو یو پی اردو اکیڈمی ایوارڈ (۱۹۸۸) اور دہلی اردو اکیڈمی ایوارڈ (۲۰۰۴) اپنے افسانوی مجموعوں کے لیے ملے۔ انہوں نے ساہتیہ اردو اکادمی اور شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کی جانب سے اردو ادب میں خواتین کے رجحانات کے موضوع پر منعقد کیے گئے سیمینار اور کانفرینس میں بھی حصہ لیا۔ ان کو ۲۰۱۴ء میں SAARC لیٹریچر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ شاعری اور نثر میں اپنے کام کے لیے انہیں متعدد قومی اور بین لاقوامی انعامات اور اعجازات سے نوازا جا چکا ہے۔ ان کے کام کو کئی ہندوستانی اور مغربی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ وہ ریڈیو اور ٹی وی پر کئی سالوں سے اردو نیوز براڈکاسٹر، مترجم اور ثقافتی پروگراموں میں کام کر چکی ہیں۔ انہوں نے کشمیر کے خاص اردو اخبارات اور جرائد میں خواتین کے کالم میں بھی ترمیم کی ہے۔

ترنم ریاض کے اب تک ۳ شعری مجموعہ منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ یہ ہیں:

۱۔ پرانی کتابوں کی خشبو۔ ۲۰۰۵

۲۔ بھادوں کے چاند تلے۔ ۲۰۱۵

۳۔ زیرِ سبزہ محدِ خواب۔ ۲۰۱۵

اس کے علاوہ ان کی تصانیف میں افسانوی مجموعوں میں ''یہ تنگ زمین (۱۹۹۸)''، ''ابابیلیں لوٹ آئینگی (۲۰۰۰)''، ''یمبر زل (۲۰۰۲)''، ''میرا رختِ سفر (۲۰۰۸)'' ہیں۔ تنقیدی و تحقیقی کتابوں میں ''بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب (۲۰۰۵)'' اور ''چشمِ نقشِ قدم (۲۰۰۵)'' بھی بہت مقبول ہیں۔ ان کے ناولوں میں ''مورتی (۲۰۰۲)''، ''برف آشنا پرندے (۲۰۰۹)'' اور زیرِ طبع ناول ''صحرا ہماری آنکھ میں'' بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔ انہوں نے ترجمے بھی کیے، جن میں ''سنو کہانی (ہندی سے ترجمہ)''، ''ہاؤس بوٹ پر بلی (انگریزی سے ترجمہ)''

اور ''گوسائیں باغ کا بھوت (ہندی سے ترجمہ)'' بھی منظرعام پر آ چکے ہیں۔ترنم ریاض کی شاعری ہندوستان اور پاکستان کے کئی مشہور رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔جن میں شیرازہ (شری نگر)، ایوانِ اردو (دہلی)، تخلیق (لاہور)، پنج دریا (جالندھر) وغیرہ شامل ہیں۔

بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ:

''ترنم ریاض کے نام پر بہت سے لوگ چونکیں گے لیکن کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ادب کی دنیا میں اپنی آہٹ سے یا آہنگ سے لہجے سے معنویت یا افسانویت سے چانکانا بھی ایک جمالیاتی عمل ہے۔''

(یمبر زل، از ترنم ریاض، نرالی دنیا پبلیکیشنز۔ص ۱۷۸)

۲

ترنم ریاض کا شمار جدید دور کی ان کامیاب شاعرہ میں ہوتا ہے جن کی شاعری میں آج کے دور کے حالات بڑے تجربے کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔وہ اپنی شاعری کے موضوعات اور عنوانات میں اکثر عورتوں، پرندے، بچوں، موسم اور موجودہ واقعات وغیرہ کی دلکش فضا بنتی ہیں اور یہ ان کی شاعری کی ایک اہم خصوصیات بھی ہے۔ان کا پہلا مجموعہ ''پرانی کتابوں کی خوشبو'' جون ۲۰۰۵ میں شائع ہوا۔اس میں ان کی ۱۳۱ نظمیں اور اس کے بعد آخر میں ۲۵ غزلیں شامل ہیں۔اس کتاب کا آغاز انہوں نے اس شعر سے کیا ؎

موتی چھوڑ کے سیپی چن لیتے ہیں بچے
چاند کی خاطر بھی پھول مچل جاتے ہیں

اس کے بعد غالبؔ کا یہ شعر شالم کیا گیا ہے ؎

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر ، سو خموش ہے

ان کی کتاب کے عنوان کا شعر اس طرح ہے ؎

عجب ہلکی ہلکی
عجب بھینی بھینی
عجب اجنبی سی
عجب اپنی اپنی
کرے یاد مہکے
مرے دل کے اندر
پرانی کتابوں کی
خوشبو کی صورت

ان کی شاعری ہر طرح کے جزباتی راگ سے بھرپور ہے جن میں محبت، نرمی، نفرت، غم، غصہ، طنز، تڑپ، ستم ظریفی کے ساتھ ساتھ عشق، حسن اور لطف وغیرہ موجود ہیں۔ سب سے خاص بات یہ ہے کہ تمام جزبات اور کیفیات کا اظہار ہوتے ہوئے بھی ان کی شاعری تھوڑی پیچیدگی لیے ہوئے ہے مگر اس میں بھی ان کے اظہارِ خیال میں لچک اور عفت موجود ہے۔

۳

ان کے کلام میں ان کے تجربات اور محسوسات کی بھرپور عکاسی نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری عہدِ حاضر کی تمام تر کیفیات سے جڑی ہوئی ہے۔ آج جو واقعات، حادثات اور حالات ہمارے سامنے پیش آرہے ہیں۔ ان کا ذکر ترنم ریاض نے اپنی شاعری میں بخوبی کے ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

یہ کس نے بوئی ہیں چنگاریاں تیری زمینوں میں
یہ کس نے آگ سی سلگائی ہے معصوم مینوں میں
کوئی ویران موسم آ بسا بارہ مہینوں میں
کہ جیسے ہوں نہ تاثیریں ہی اب جھلکتی جبینوں میں

کسی نے باغباں بن کر جلایا مرغزاروں کو
کسی نے بائیاں بن کر اجاڑا بہاروں کو

ان کی نظموں کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ غمِ یار اور غمِ بہار ہی سب کچھ نہیں ہیں غمِ جہاں کو بھی محسوس کرنا چاہئے۔ان کی شاعری میں تصوف کا رنگ بھی موجود ہے۔

بقول بلراج کومل:

''ترنم ریاض کی شعری کائنات، مظاہرہ فطرت سے کے کر انسانی مسائل اور انسانی رشتوں کی گونا گوں کیفیات کی فنکارانہ تجسیم سے وابستہ ہے لیکن اس عمل میں نہ تو وہ موضوعات کی میزان سازی کرتی ہیں اور نہ ہی کوئی اشتہاری اعلان نامہ تیار کرتی ہیں۔ان کی نظمیں اپنے متنوع دائرہ کار میں انسانی ردِعمل کی انتہائی نرم و نازک مثال ہیں اور منطقی نتائج مرتب کرنے کے بجائے قاری کے دل میں جمالیاتی کیف و انبساط کی روشن فضا خلق کرتی ہیں۔وہ نظم کو ایک نامیاتی اکائی کے روپ میں دیکھتی ہیں اور بکھراؤ اور لسانی انتشار سے گریز کرتی ہیں۔غالباً اس لئے ان کی نظمیں محض تحریری نہیں ہیں بلکہ متکلم تصویریں ہیں۔''

(پرانی کتابوں کی خشبو، از ترنم ریاض، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی۔ص۲)

۴

ترنم ریاض کا دوسرا شعری مجموعہ ''بھادو کی چاند تلے'' ۲۰۱۵ میں اردو اکادمی دہلی سے شائع ہوا۔ یہ ان کے ماہیئے کا مجموعہ ہے۔ ماہیئے پنجاب کی ایک مقبول شعری صنف ہے۔ یہ تین مصرعوں والی نظم ہوتی ہے۔اس کتاب کی ابتداء اس شعر سے کی جس کو انہوں نے پروفیسر ریاض پنجابی کے لیے کہا۔

صدا، نغمگی، طرز، آہنگ ساز

ترنم کی تکمیل، طاقت ریاض

ان کے ماہیے کی زبان صاف وسادہ، آسان اور دلکشی لیے ہوئے ہے۔اس مجموعہ میں ان کے حمدیہ ماہئیوں کے ساتھ ساتھ مختلف عنوانات کے ماہیئے بھی شامل ہیں۔انہوں نے ماہیئے کے آہنگ پر خصوصی توجہ دیتے ہوئے اسے نغمہ ساز اور بنایا ہے۔ان میں ہر طرح کے موضوعات غرض کہ حسن وعشق کے نغمے، زنانے کے مسلہ، بے وفائی، موسم، فطرت، زندگی وغیرہ کے معاملات شامل ہیں۔چند مثالیں پیش ہیں ۔

ذروں پر نام لکھا
سانس ہیں رب تو ہی
ہر شے ہیں ہے نور ترا

مٹی کی مہک آئے
ماہیئے لکھے ہوئے
من خوشبو سے بھر جائے

سن کر کوئل کی کوک
رت برساتوں کی
مرے دل میں اٹھے ہے ہوک

ترنم ریاض کا تیسرا مجموعہ ''زیرِ سبزہ محوِ خواب'' ہے۔یہ بھی اردو اکادمی دہلی کے مالی تعاون سے ۲۰۱۵ میں شائع ہوا۔یہ مجموعہ ان کی پابند نظمیں، آزاد نظمیں اور غزلوں پر مبنی ہے۔اس کی ابتداء میں جو شعر کیا ہے وہ انہوں نے کشمیر کے نام کیا ہے ۔

مخالف ساعتوں میں تجھ کو ہمدم کون رکھے گا
مری وادی ترے زخموں پہ مرہم کون رکھے گا

۵

ترنم ریاض نے بچوں اور عورتوں کے جزبات کا اظہار اپنی شاعری میں بخوبی کیا ہے۔ وہ عورتوں کو ہمیشہ اولیت پر رکھتی ہے۔ترنم ریاض کی خاصیت یہ ہے کہ ان کی شاعری میں تجربہ کا رنگ اور روایت کا بھرپور شعور ملتا ہے۔ان کی شاعری کا بیانیا انداز ان کی اپنی ذات کے ساتھ ساتھ اعلیٰ اقدار اور تہزیب پرمبنی ہے۔ وہ ایک ایسی شاعرا ہیں جو اپنی شاعری کو سادہ اور آسان انداز میں بیان کرتے ہیں۔ان کے فن کی خصوصیات یہ ہے کہ وہ حقیقت پسند ہیں۔ وہ اپنے شعری موضوعات کا انتخاب بڑی تازگی اور سادگی سے کرتے ہیں۔ ان کی شعری تخلیقات میں وطن سے محبت اور خاص کر کے کشمیر کی خوبصورتی دکھائی دیتی ہے۔ان کا اظہارِ خیاک قابلِ ذکر ہے۔

اردو ادب میں عشقہ شاعری کی ایک خاص روایت ہے۔ خاص کر کہ غزلیں روایتی طور پر شاعروں کی آوازوں کے ساتھ وابستہ ہیں جس میں مہوبہ کی خوبصورت صفات کا ذکر ہے۔ مگر ترنم ریاض کی شاعری میں رومانیت کم ہے۔ان کی غزلیں اور نظمیں مختصر، عین مطابق و معاشی ہیں۔ ان میں ترنم اہم اور برقرار رہتا ہے۔ان کی شاعری قارئین کو خود بہ خود سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ چند اشعار ملاحظی ہوں۔

ذرا ذہن کو یاد کی وادیوں میں کھلا چھوڑ آئیں
کہ دامن سے لاضی کی ان دولتوں کو بھلا کیوں لٹائیں

منہ بسورے یہ شام کھڑکی پر
آن بیٹھی ہے دوپہر ہی سے
دل کہ جیسے خزاں زدہ پتہ
ٹوٹنے کو ہے،
کوئی بات کرو!

لگی رہتی ہیں در پر عمر بھر ماں باپ کی آنکھیں
نکل جاتے ہیں بچے خوابوں کے تعاقب میں

ترنم ریاض ایک شاعرہ اور افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرے کے مختلف مسائل پر ہمدردی کے ساتھ غور وفکر کرنے والی حساس دل انسان بھی ہیں۔ان کی شاعری کی خوبی دلکش فضا آفرینی ہے۔یہ ترنم ریاض کے فن کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

بقول وارث علوی:

''ترنم ریاض صحیح معنی میں ایک خلاف ذہن کی مالک ہیں۔''

(چشمِ نقشِ قدم،از ترنم ریاض،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی۔ص۲)

☆☆☆

تہذیبی واخلاقی اقدار کا بحران اور اردو ناول

ڈاکٹر واثق الخیر

E mail: wasujnu@gmail.com

تہذیب کسی بھی سماج اور کسی بھی قوم کے عقیدے اور نظریات، رسم و رواج، آداب و اطوار، رہن سہن، طرز زندگی، بود و باش، رفتار و گفتار، اخلاق، معاملات، علمی، ادبی، فنی اور سائنسی کارناموں، طرز حیات اور انداز تمدن اور علمی وفنی سرمائے کا نام ہے۔ جو کسی بھی انسان کی شناخت اور اس کی بقا کی ضمانت ہے۔ انسان نے اپنے انفرادی بود و باش سے اجتماعی وسماجی رہن سہن تک کے سفر میں کائنات کی وسعتوں میں ذہنی، سماجی، اخلاقی، مادی اور روحانی کیفیات واکتسابات کے مختلف منزلوں سے گزرتے ہوئے جن چیزوں کو حاصل کیا ہے اسی کا نام تہذیب ہے۔ تہذیب صرف کسی خاص طرح کی شائستگی اور ادب و آداب سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کے مختلف زاویے ہیں، مختلف دائرے اور حلقے ہیں۔ رجحانات اور میلانات ہیں۔ رسم و رواج، نظام معاشرت، رہن سہن، ملبوسات، زیورات، اقتصادی تنظیم، معاشرتی ادارے، سیاست و تمدن، اقتصادی و معاشی امور کی لین دین، تجارت، زراعت، صنعت وحرفت، تعمیرات، شہری انتظام، صحرا نشینی اور مذہبی معاملات وغیرہ انسانوں کی زندگی میں داخل رہے ہیں اور ان سب کا زاویہ اور نظریہ انسانی تہذیب واخلاق کا حصہ ہیں۔

تہذیب کا خاکہ بڑی حد تک انسان کا اپنا ساختہ پرداختہ ہے۔ ظاہر ہے اس کا تعلق معاشرے سے ہے، چنانچہ تہذیب خلا میں جنم نہیں لیتی۔ یہ تو حقیقت ہے کہ تہذیب کے بعض

رویے کسی قوم کو وراثت میں ملتے ہیں تاہم ان رویوں کا نام بھی تہذیب ہے جو وہ اپنے خاص ماحول میں خاص عقائد و افکار اور دوسرے اثرات کے تحت پیدا کرتا ہے۔ یہ اکتسابی عمل بھی کسی قوم کی تہذیب میں یگانگت اور دوسری اقوام سے امتیاز و اختلاف پیدا کرتا ہے۔ اس لحاظ سے تہذیب فرد اور اجماع دونوں کا مشترکہ سرمایہ ہے۔

تہذیب وسیع ترین ثقافتی اکائی کا نام ہے۔ یہ نام ہے اقدار کے ہم آہنگ وشعور کا، جو ایک انسانی جماعت رکھتی ہے۔ جسے افراد اپنے جذبات، رجحانات، اپنے برتاؤ اور اثرات میں ظاہر کرتے ہیں۔ ہر معاشرہ بالعموم ان قدروں کو اپنی جان، مال اور جائیداد سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ ان تہذیبی قدروں کے لیے کسی قوم میں بڑی جذباتیت ہوتی ہے۔ ہر قوم مختلف اشیاء، عقائد، خیالات اور دیگر تہذیبی قدروں کو اپنے اقدار کی کسوٹی پر پرکھتا ہے جو قدریں، جو چیزیں اس کسوٹی پر پورا اتریں وہ قبول کر لی جاتی ہیں۔ ان قدروں کی بنیاد معاشرے میں، زمین ہی میں موجود ہوتی ہیں۔ نہ یہ جبراً نافذ کی جاتی ہے نہ آسمان سے اترتی ہیں۔ بلکہ ان کے پس پست صدیوں کے تاریخی رواج کارفرما ہوتے ہیں۔ معاشرے کے کسب و جہد، مشاہدات اور تجربات ہوتے ہیں۔ اس کا فکری آہنگ اور جمالیاتی ذہن ہوتا ہے اور عموماً معاشرے کے افراد ان کی پابندی کرتے ہیں۔

ہندوستان روز اول سے ہی مختلف قوموں اور تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے۔ گذشتہ کئی صدیوں سے یہاں دنیا کے مختلف خطے سے قومیں تجارت اور سیر وسیاحت کی غرض سے آتی رہی ہیں جو بعد میں یہیں کے ہو کر رہ گئیں۔ یہ قومیں اپنے ساتھ اپنی زبان، رنگ و روپ، آداب و اطوار، طرز معاشرت، اخلاق و عادات کے علاوہ عقائد و نظریات بھی لائیں۔ غیر ممالک سے آئے ہوئے تہذیبی سرمائے اور یہاں کی تہذیبی ذخیرہ میں اتصال اور میل جول کا عمل صدیوں تک قائم رہا اور آج بھی جاری ہے۔ اسی اتصال اور میل جول سے جو تہذیب نکل کر آئی اسے ہندوستانی تہذیب کا نام دیا گیا۔

ہندوستان کے عہد قدیم سے لے کر تقسیم ملک تک یہاں کی تہذیبی و ثقافتی فضا کئی

مراحل سے گزر کر مختلف دھاروں کے امتزاج سے ایک وحدت میں ڈھلتی چلی گئی۔ بھگتی تحریک اور تصوف کی بنیاد انسان دوستی اور محبت کی تلقین پر مبنی تھی۔ اس تحریک نے سارے ملک کو ایک وحدت میں پیش کیا۔ صوفیوں اور بھگتوں کی نظر میں سارے مذاہب یکساں تھے۔ اس تحریک نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں متحد کرایا تھا۔ ہندو مسلمان آپس میں خلوص و محبت کے ساتھ رہتے تھے۔ اسی اتصال اور میل جول کے عمل سے مشترکہ ہندوستانی تہذیب نے جنم لیا جو بلا شرط مذہب و ملت سب کے لیے قابل قبول ہوئی اور ہندوستان کی پہچان بن گئی۔

اردو کے ناول نگاروں نے ہندوستان کی زوال پذیر تہذیب و ثقافت کو اپنے ناولوں میں جگہ دی ہے۔ اور اس کا بیان کر کے اپنے درد کا اظہار کیا ہے اور آئندہ کے نسلوں کو ایک سبق بھی دیا ہے کہ تہذیبی و ثقافتی قدروں کی حفاظت کتنی ضروری ہیں۔ اس طرف متنبہ بھی کیا ہے کہ ان قدروں کے زوال سے سماج کو کن مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

احسن فاروقی کا ناول 'شام اودھ' لکھنؤ کی جاگیردارانہ زوال پذیر معاشرت اور تہذیب کی عکاسی کرتا ہے۔ ناول میں جس سماج و معاشرے کو موضوع بنایا گیا ہے وہ تہذیبی اعتبار سے انتہائی شکست خوردہ ہے۔ نواب ذوالفقار علی خان کو مرکزی کردار بنا کر نوابی دور کی انحطاط پذیر تہذیب کو سامنے لایا گیا ہے۔ ناول نگار نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ لکھنؤ کی تہذیب کا سب سے اہم مرکز ایک نواب کا محل ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ اعلی اور نواب طبقے کے لوگوں کے پاس ایک وضع قطع ہوتا تھا۔ اس میں زندگی گزارنے کے کچھ اصول وضوابط ہوتے تھے۔ اس لیے جب تک ان کے اندر اعلی انسانی اقدار باقی تھیں تو وہ زندہ رہیں لیکن جب ان میں طرح طرح کی برائیاں اور بداخلاقیاں پیدا ہوئیں تو وہ زوال کا شکار ہوکر رہ گئیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ناول پر اظہار کیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شام اودھ میں حقیقی سطح پر تو اودھ کی تہذیب کی تخریب و بربادی کا نقشہ
> سامنے آتا ہے لیکن ذہنی سطح پر اس میں زوال کی وہی تصویر ابھرتی ہے جو

آفاقی ہے۔'شام اودھ' میں تہذیب کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ بے جان اور بے حس و حرکت نہیں بلکہ اس میں کشمکش اپنی نمایاں ہے کہ رُجعت پرست کھوکھلے نظام کے اندر ہی سے ترقی کی قوتیں ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ نواب صاحب رُجعت کے نمائندہ ہیں لیکن اپنے ایک غیر کفو بھتیجے کو، اس کے باپ کی وصیت کی بنا پر وہ انگریزی تعلیم دلا رہے ہیں اور اس سارے عمل سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ معاشرہ و تہذیب اندر ہی اندر بدل رہے ہیں اور پرانی اقدار کے غیر انسانی عناصر فنا ہو کر نئی صورت کو جنم دے رہے ہیں۔"(13)

قرۃ العین حیدر کا ناول 'میرے بھی صنم خانے' اودھ کے زوال پذیر جاگیردارانہ معاشرے کی مٹتی ہوئی تہذیبی قدروں کی نشاندہی کرتا ہے۔ ناول میں رخشندہ کا پورا خاندان ہوتا ہے۔ جس پر تقسیم کے اثرات پڑتے ہیں۔ ناول میں اودھ کی مشترکہ تہذیبی وراثت کا ذکر بڑے غمناک انداز میں کیا گیا ہے کہ کیسے وقت کی ایک ٹھوکر میں صدیوں کی وراثت منتشر ہو جاتی ہے۔ اقتباس دیکھیں:

"تہذیب کے مرکزوں اور گہواروں میں پلنے والے دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے صحراؤں کی طرف نکل گئے۔ امام باڑے ویران اور مسجدیں شکستہ ہو گئیں۔ پرانے خاندان مٹ گئے۔ زندگی کی پرانی قدریں خون اور نفرت کی آندھیوں کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ ایک عالم تہہ و بالا ہو گیا۔ وہ تہذیب ہندوؤں اور مسلمانوں کا وہ معاشرتی اور تمدنی اتحاد وہ روایات وہ زمانہ سب کچھ ختم ہو گیا۔"(14)

عصمت چغتائی کا ناول 'معصومہ' آزادی کے بعد حیدرآباد کے مسلم گھرانے کی تہذیبی و اخلاقی قدروں کو بیان کرتا ہے۔ آزادی کے بعد رئیسانہ زندگی گزارے ہوئے مسلم سماج کی حالت

زار کو دکھایا ہے کہ کیسے ایک شریف لڑکی کال گرل بن جاتی ہے۔اس کے پیچھے دراصل سماج کا وہ چہرہ سامنے آتا ہے جس کی وجہ سے معصومہ اس دلدل میں پھنس جاتی ہے۔آزادی کے بعد بہت سے ایسے گھرانے ہوتے ہیں جو تہذیبی و اخلاقی طور پر بحرانی صورت حال سے گزرتے ہیں۔

اسی طرح ''ٹیڑھی لکیر'' میں تہذیبی و اخلاقی قدروں کی بحرانی صورت حال پر روشنی پڑتی ہے۔ناول کا کردار شمن کو اسکول کی زندگی میں ایک لڑکی سے جنسی لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔گھر کا ماحول مشرقی تھا۔کالج اور اسکول میں اسے نئی زندگی ملتی ہے، حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ اسے بھی بدلنا پڑا اور نئے ماحول میں وہ اپنی ان جنسی خواہشات کا حل چاہتی تھی جو اس کے لاشعور میں بچپن سے موجود تھیں لیکن گھر کا ماحول جگہ جگہ رکاوٹ بنتا ہے جس سے اس کے مزاج میں چڑچڑاپن پیدا ہو جاتا ہے۔دراصل ان کے اندر جو تبدیلی آ رہی تھی وہ قدیم اور جدید تہذیب کے درمیان جو کشمکش چل رہی تھی اس کی وجہ سے ہوئی تھی۔مسلم متوسط گھرانوں میں پردے کا رواج رفتہ رفتہ ختم ہوتا جا رہا تھا۔گویا مسلم سماج کی جو قدیم تہذیبی و اخلاقی قدریں تھیں وہ بحرانی دور سے گزر رہی تھیں۔

عزیز احمد کا ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' میں آزادی کے بعد بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں مختلف گھرانوں کی تہذیبی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ایک طرف ملک میں آزادی کی لڑائی لڑی جا رہی ہے اور دوسری طرف شمالی ہند سے دور حیدر آباد کے اعلی طبقے عیاشیوں میں زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔حیدر آباد کے نوابوں کا دوسری شادی کرنا اور گھر میں دلجوئی کے لیے کنیزوں کا رکھنا عام سی بات ہو گئی تھی۔اسی طرح عورتوں کا مردوں کی محفل میں شراب پینا، رقص کرنا، تاش کھیلنا، اور مغربی طرز کا لباس پہننا اعلی طبقے کا معمول بن گیا تھا۔عزیز احمد نے ناول میں نور جہاں اور سلطان حسین کے کردار میں ازدواجی زندگی کی پیچیدگیوں کو بڑی باریکی سے پیش کر کے اعلی طبقے کی ذہنی پستی پر روشنی ڈالی ہے۔سلطان حسین کا اپنی بیوی نور جہاں سے خراب سلوک کرنا اور اجنبی و حسین لڑکیوں سے فلرٹ کرنا، کلب میں جانا اور شراب پینا وغیرہ تہذیبی و اخلاقی قدروں کی بحرانی صورت حال کو بیان کرتا ہے۔

عہد جدید کی انسانی زندگی میں تہذیبی و اخلاقی بحران اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے کیوں کہ ہر شئے بناوٹی اور تجارتی ہوگئی ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ دوستی، محبت، اخلاق و مذہب، عزت و عصمت، علم و حکمت سب تجارتی شئے بن گئے ہیں۔ آج مادہ پرستی عام ہے اور ہر شعبے پر چھا گئی ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ جدید تہذیب کلیتاً مادی ہے۔ جسے انسان نے اس لیے نہیں اپنایا ہے کہ وہ اس کے مزاج اور فطرت سے ہم آہنگ ہے بلکہ انسان کو مشینی اور سائنسی ایجادات اور مادی ترقی کے سیلاب نے یہ موقع ہی نہیں دیا کہ وہ اس بارے میں سوچتا اور اس کے مثبت و منفی پہلوؤں پر غور و فکر کرتا۔ چنانچہ انسان اس سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہتا چلا گیا۔ دور حاضر میں ہوسنا کی، مال و زر کی رغبت، جنسی خواہشات میں بڑے چھوٹے سبھی مبتلا ہیں۔ جدید علم نفسیات نے جنسی اور دیگر مذموم خواہشات کو بڑھاوا دے رکھا ہے۔ جس کے باعث نفوس آزاد ہیں۔ صبر و تحمل، سکون و راحت راندۂ درگاہ ہو چکے ہیں۔ تعلیم اگرچہ عام ہے لیکن وہ طلبہ پیدا نہیں ہو رہے ہیں جو اخلاق و کردار کا بلند نمونہ ثابت ہوں۔ کتب خانوں، کتابوں، رسالوں اور اخبارات کی کھلی نمائش ہے لیکن لوگوں کا گھٹیا قسم کی کتب جو غیر ادبی اور غیر معیاری یعنی شہوانی جذبات کو بھڑکانے والے ناول اور افسانے وغیرہ پڑھنے کی طرف رجحان زیادہ ہے۔ جس سے اخلاق و مذہب اور روحانیت سے عاری ہو رہے ہیں۔ بہرحال جدید تہذیب غیر محسوس طریقے سے انسانوں کی زندگی پر حاوی ہو رہی ہے۔ لوگوں نے نیکی و بدی کا امتیاز کھو دیا ہے۔ ان تمام بد اخلاقیوں اور گمراہیوں کو اپنا لیا ہے۔ جن سے دور رہنے یا بچنے کے لیے مذہب و قانون انسان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ لیکن اب انسان نے مادی آسائشوں کے حصول کی خاطر مذہب و قانون اور تمام سماجی، تہذیبی و اخلاقی ضابطوں کو پس پشت ڈال دیا ہے اور ایک ہی رنگ میں رنگے جا رہے ہیں۔ جو ہندوستان کی تہذیبی و اخلاقی اقدار کے لیے بڑے چیلنجز ہیں۔ یہ وہ چیلنج ہے جس میں ہندوستانی تہذیب اور مغربی تہذیب آپس میں متصادم ہیں اور ایک دوسرے کو زیر کرنے کے فراق میں ہیں جس میں کبھی مقامی تہذیب غالب آتی ہے تو کبھی مغربی تہذیب۔ لیکن مغربی یعنی جدید تہذیب کے یلغار سے قدیم تہذیب کب تک بچ

سکتی ہے۔جدید تہذیب اپنے نئے لالی پوپ سے پرانی تہذیب کو متاثر کرتی رہتی ہے اور اسے زیر کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

جدید دور کے اردو ناول نگاروں نے مذکورہ بالا باتوں کو بڑی فکر مندی سے لیا اور اپنے ناولوں کے ذریعے بدلتے تہذیبی منظر نامے اور ان کے چیلنجز کو بہت ہی اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ان کے یہاں زندگی کی ماہرانہ ڈھنگ سے پیش کش موجود ہے۔جس میں سیاسی،سماجی اور تہذیبی حالات سے آ گہی کو بڑے سلیقے سے بڑتا گیا ہے۔سماجی و تہذیبی کمزوریوں اور خوبیوں، اچھائیوں اور برائیوں کا بیان منصفانہ طریقے پر ملتا ہے۔فکشن نگار غضنفر دور جدید کے ادب پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’بدلتے ہوئے تہذیبی، سماجی، سیاسی، ثقافتی، اقتصادی اور مذہبی منظر نامے کی اتھل پتھل، ناپائیداری، سراسیمگی اور اس میں نہاں انسان کی بنیادی کمینگی، خودغرضی اور ریاست اور بین الاقوامی سیاست کی مکاریوں کے قائم کردہ فلاحی ڈھونگ اور نئی اجارہ داریاں قائم کیے جانے کے سازش کے تحت ان سازشوں کو کمک پہنچانے والی نئی زمان میں پوشیدہ بغض وعناد آج کے ادیب کے لیے ادب تخلیق کرنے کے کاروبار کے واسطے اہم محرکات بن رہے ہیں‘‘۔ (23)

دور جدید کے ناول نگار اپنے ناولوں میں وہی کچھ پیش کررہے ہیں جو ان کے تجربات و مشاہدات کا حصہ ہیں۔زندگی کا کینوس اتنا وسیع اور رنگارنگ ہے کہ اس کی نیرنگیاں اور حیرتناکیاں ہمارے لیے محرکات کا خزانہ سمیٹے ہوئے اس رسم کے انتظار میں چشم براہ رہتی ہیں جو اس عالمی سکھ دکھ میں شریک ہونے کا موقع دیتی ہیں۔زندگی اور زمانہ ہمارے لیے نئے نئے تجربات،مطالبات اور واقعات کا مجموعہ ہماری حیرت،ٹکراؤ،خوف،تسکین اور تسلی،امید وبیم،یقین وگمان،انتظار اور اعتماد کی قوتوں کو بیدار رکھتا ہے اور زندگی کی معنویت،حیات و کائنات کے ربط اور رشتوں کے

بارے میں سوال جواب کے سلسلے کو قائم کرتا ہے۔خورشید عالم لکھتے ہیں کہ:

> ''گذشتہ دس پندرہ سال میں ہماری زندگی میں سماجی، سیاسی، معاشی اور فکری سطحوں پر نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ہمارے جینے کا ڈھنگ بدلا ہے، سوچنے کا انداز بدلا ہے، قدروں کے پیمانے بدلے ہیں اور مسائل کی شکلیں بدلی ہیں۔ بنیاد پرستی، ذات پات، آدرشوں کا فقدان، دہشت گردی کا زور، ملٹی نیشنل کمپنیوں کی آمد، صارفیت کا غلبہ اور کالے دھنوں کے فروغ سے آج کی زندگی اثر پذیر ہوئی ہے۔ مزید یہ کہ الیکٹرانک میڈیا کی ترقی کے بعد آج کا فن کار قصباتی، شہری اور ملکی حدود سے نکل کر ساری دنیا سے جڑ گیا ہے یعنی اس کے تجربات اور مشاہدے کے لیے ایک بڑا کینوس تیار ہو گیا ہے''۔(24)

موجودہ دور میں ہندوستان میں تہذیبی و اخلاقی اقدار کو درپیش چیلنجز ہیں۔ان چیلنجز کا عکس آٹھویں دہائی کے ناولوں میں بخوبی دیکھنے کو ملتا ہے۔اقبال مجید کا ناول ''نمک'' لکھنؤ کی تہذیبی و اخلاقی اقدار سے شروع ہو کر بیسویں صدی کے آخری عشرے کی مادی تہذیب پر ختم ہوتا ہے۔ جو اس سوال کو اٹھاتا ہے کہ اکیسویں صدی کی نئی بنتی ہوئی تہذیب میں ادب اور پرانی تہذیب کی کوئی حقیقت باقی رہے گی بھی یا نہیں یا پھر انسان صرف کمپیوٹر میں فیڈ، لیپ ٹاپ کی فصیلوں پر منحصر اور کلون میں اسیر ہو کر رہ جائے گا۔اسی طرح موجودہ تہذیب کے حساب سے کیا علم، کلچر اور اخلاقیات سے پرے رہے گا۔ایک ہی گھرانے کی تین نسلوں کے ذریعہ تہذیبی و اخلاقی اقدار میں جو بڑی تبدیلی آتی ہے اس کو دکھایا ہے۔تہذیبی و اخلاقی اقدار کے طور پر سب سے زیادہ چیلنجز تیسری اور نئی نسل کے سامنے آتے ہیں۔ یہ تیسری نسل پوتے پوتیوں، نواسوں نواسیوں اور ان کے نوجوان دوستوں کی ہے جو سائنسی ترقی کمپیوٹر، لیپ ٹاپ، انٹرنیٹ، موبائل وغیرہ میں الجھتے جاتے ہیں۔ یہ نسلیں ساری ترقیوں اور کامیابیوں کو مٹھی میں بند کرنا چاہتے ہیں جس میں وہ کامیاب بھی

نہیں ہوتے ہیں۔ وہ منزلوں کی تلاش میں بھاگ رہے ہیں اس کے لیے وہ کبھی جنسی آسودگی کا سہارا لیتے ہیں اور کبھی نشیلی اشیاء کا استعمال کر کے بے راہ روی کے شکار ہوتے ہیں۔ سائنسی ترقی کے بے بنیاد فلسفوں اور منتشر خیالات اور طرز فکر کا اظہار کر کے ماضی سے ان کا کوئی سروکار نہیں رہتا۔ حال سے یہ مطمئن نہیں ہوتے اور مستقبل کا کوئی پتہ نہیں ہوتا ہے۔ ان نسلوں کے سامنے عالم کاری، ماس میڈیا اور جدید تکنالوجی ایک چیلینج کے طور پر سامنے آتی ہے۔ جس میں سارے لوگ تہذیبی و اخلاقی طور پر بہہ جاتے ہیں۔

آزادی کے کچھ دہائی بعد ہندوستان میں مغربی تہذیب کے اثرات سے جو تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس کی وجہ سے مغرب پرست نوجوانوں میں اخلاقی پستی، روایتوں سے انحراف عام سی بات ہوگئی۔ مغرب پرست نوجوانوں اور ان کے مشرقی ماحول میں پرورش یافتہ والدین کے درمیان ذہنی ہم آہنگی نہیں رہی ہے۔ ایسے حالات میں نئی نسل اپنے والدین کو سمجھ نہیں پاتے ہیں اور نہ ہی والدین اپنی نئی نسل کو۔ ناول 'فرات' میں اس کی بہترین مثال ملتی ہے۔ ناول کا کردار تبریز مغرب پرست، جدید تعلیم یافتہ اور آزاد خیال کا پیداوار ہے تو دوسری طرف اس کے والد وقار احمد مذہبی اور اخلاقی ذہنیت رکھنے والے ہیں۔

حسین الحق نے اپنے ناول ''فرات'' میں ہندوستان کی قدیم تہذیب و اخلاق کے سامنے جو چیلینجز آرہے ہیں اور ان کی وجہ سے تہذیبی سطح پر جو تبدیلی آرہی ہے اس کا بے باکانہ اظہار کیا ہے۔ جہاں پہلے میاں بیوی کے درمیان ایک پردہ ہوتا تھا لیکن اب حالت یہ ہے کہ بیٹیوں کے سامنے یہ والدین اپنے کپڑے بدل رہے ہیں۔ دراصل یہ تبدیلی اس کلچر کی وجہ سے ہے جو سماج کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے۔ حد تو یہ ہے کہ بیٹی اپنے بوائے فرینڈ کا ذکر کرتی ہے لیکن ماں اسے کچھ نہیں ٹوکتی ہے بلکہ باپ کے کہنے پر پرتپاک لہجے میں کہتی ہے کہ آپ کو کیا ہو گیا ہے جو بار بار ٹوکتے رہتے ہیں۔ دور حاضر کی نئی نسلوں میں یہ عام سی بات ہوگئی ہے کہ وہ بلا روک ٹوک غیر محرم سے مل سکتے ہیں۔ نوجوان لڑکا لڑکی آپس میں دوستی کر سکتے ہیں یہاں تک کہ آپس میں

اختلاط بھی قائم کر سکتے ہیں۔ مندرجہ ذیل کے اقتباس سے موجودہ دور کے اخلاقی اقدار کے حدود کا پتہ چلتا ہے کہ زمانہ قدیم میں کسی غیر محرم کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنا جرم عظیم سمجھا جاتا تھا لیکن آج کے دور میں سیکس کے علاوہ ہر چیز اخلاقی حدود میں آتا ہے۔

علی امام نقوی کا ناول ''تین بتی کے راما'' میں بدلتی تہذیب کو ممبئی کی سماجی زندگی کے باطن کو گھریلو ملازمین کے ذریعہ پیش کرتا ہے کہ مہانگروں کے نوٹ زدہ معاشرے میں جائز و ناجائز طریقوں سے کمائی گئی دولت سیٹھ اور سرمایہ دار اپنی اکتاہٹ دور کرنے کے لیے کبھی شراب سے دل بہلاتے ہیں اور کبھی ملازموں سے مستفید ہوتے ہیں اور کبھی ایک دوسرے کی بیویوں کا تبادلہ کر کے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ دوسری طرف بھاری زیورات اور قیمتی ساڑیوں میں ملبوس سیٹھانیاں بھی گھریلو ملازموں کو پالتی ہیں۔ ناول میں بیویاں بدلنے کے کھیل کو بیان کر کے شہر میں تہذیبی و اخلاقی زوال کی داستان سنائی جا رہی ہے جو بڑے شہروں کے ایک کلاس میں فیشن اور شوق کے طور پر پروان چڑھ رہا ہے۔ اس ناول میں ممبئی کے تاجروں، سرمایہ داروں، ان کی بیویوں اور گھریلو ملازمین کے درمیان جسمانی تعلقات کو دکھایا ہے کہ ان کے درمیان تہذیبی قدریں ختم ہوگئیں ہیں۔ ان سب کے درمیان ایک خاموش معاہدہ ہے جس کے تحت دولت مندان ملازموں اور ملازماؤں کو من مانے طریقوں سے استعمال کرتے ہیں۔ اور بدلے میں انہیں چند روپیوں، اچھے کپڑوں اور مہنگے کھانوں و شرابوں کی رشوتیں دیتے رہتے ہیں۔ اس طرح فارم ہاؤس، پکنک مرکزوں اور پرائیوٹ فلیٹوں اور پرسنل بیڈروموں میں اس نئے معاہدہ، عمرانی تکمیل و توثیق ہوتی رہتی ہے اور اس اعلی طبقہ کی شرافت و اسٹیٹس کو بھی کوئی گزند نہیں پہنچتی۔

عبدالصمد کا ناول ''دھمک'' تہذیب و تمدن، معاشرہ اور سیاست مل کر اپنے عہد کے آشوب کی شکل اختیار کرتا ہے۔ آج سیاست اتنی گندی ہوگئی ہے کہ اس کی وجہ سے جو بھی اس میدان میں جاتا ہے وہ اس کے جال کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک لڑکے کے حوالے سے بات کی گئی ہے کہ وہ لڑکیوں کی آبروریزی پر سخت احتجاج کرتے ہوئے جب سیاست کے میدان میں پہنچ جاتا

ہے تو گندی سیاست ضمیر کی آواز کو دباتے ہوئے خود بے ضمیری کا شکار ہو جاتا ہے اور سیاست کے داؤں پیچ کو سیکھتے ہوئے سود و زیاں سے واقف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک سماج سیوک عورت کا ذکر ہے جو حاکموں کو عیاشی کا سامان فراہم کراتی ہے۔ اس گورکھ دھندھے کے لیے مظلوم لڑکیوں کو بھی شامل کر رکھا ہے۔ جنھوں نے اپنی عصمت کے تار تار ہونے کے بعد اس کے یہاں پناہ لے رکھی ہے۔

نئی نسل کے چال ڈھال اور عادات و اطوار میں تبدیلی آ گئی ہے۔ یہاں تک کہ کپڑے وغیرہ بھی اس قدر ہیجانی پہننے لگے ہیں کہ لگتا ہی نہیں کہ کپڑا پہنے ہوئے ہے یا ننگے ہیں۔ جسم کے خدو خال پوری طرح عیاں ہوتی ہیں۔ ان نسلوں کو نہ اپنی عزت اور نہ ہی اپنے سے بڑوں کا خیال رہتا ہے۔ مشرف عالم ذوقی کا ناول 'پوکے مان کی دنیا' میں اس کا بیان ملتا ہے۔ خونی رشتوں کے درمیان اخلاقی و تہذیبی گراوٹ پیدا کر دی ہے۔ نئی نسل کے اندر اخلاقی و تہذیبی گراوٹ اس قدر آ گئی ہے کہ وہ اپنے والدین کی پرواہ بھی نہیں کرتے ہیں کہ جو وہ کر رہے ہیں اس سے والدین کو کتنی کوفت محسوس ہوتی ہوگی۔ یہ چیلنج ہی تو ہے جو قدیم نسل کو ستائے جا رہی ہے۔ جدید تکنالوجی نے جب سے دنیا کو عالمی تصور میں تبدیل کر دیا ہے اس وقت سے تہذیبوں کے تصادم کی وجہ سے اخلاقی قدروں کا زوال ہوا ہے۔

اس دور کے ناولوں میں جا بجا اس طرح کی مثالیں مل جاتی ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری قدیم تہذیبی و اخلاقی قدروں کو درپیش چیلنجز ہیں۔ کیونکہ اس دور میں ہر طرف سے ان قدروں کو مٹانے کے لیے حملے ہو رہے ہیں۔ لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی اس دلدل میں پھنستے جا رہے ہیں۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہماری تہذیبی و اخلاقی قدریں بحرانہ دور سے گزر رہی ہیں۔

☆☆☆